ایام گذشتہ کے چند اوراق

ڈاکٹر نبی بخش خان بلوچ

تعلیقات و حواشی

ڈاکٹر محمد ادریس سومرو

محکمۂ ثقافت، حکومت سندھ

ایام گذشتہ کے چند اوراق

ڈاکٹر نبی بخش خان بلوچ

تعلیقات وحواشی

ڈاکٹر محمد ادریس سومرو

محکمہ ثقافت، حکومت سندھ

2014ء

نام کتاب:	ایام گذشتہ کے چند اوراق
مصنف:	ڈاکٹر نبی بخش خان بلوچ
سالِ اشاعت:	2014ع
تعداد:	ایک ہزار
تعلیقات وحواشی:	ڈاکٹر مولانا محمد ادریس سومرو
کمپوزنگ:	اسداللہ سعید مہر
مطبع:	سندھیکا اکیڈمی، کراچی
ناشر:	محکمہ ثقافت، حکومت سندھ
قیمت:	200 روپے

تیار کردہ

ڈاکٹر این اے بلوچ انسٹی ٹیوٹ آف ہیریٹیج ریسرچ

محکمہ ثقافت، سیاحت و نوادرات، حکومت سندھ

بنگلہ نمبر-1 پرانی وحدت کالونی اپوزٹ پولی ٹیکنیکل کالج قاسم آباد حیدر آباد

فون: 022-2102559 موبائیل 0333-2683907

ملنے کا پتہ

بک شاپ، محکمہ ثقافت

بالمقابل، ایم پی اے ہاسٹل،

غلام حسین ہدایت اللہ روڈ، کراچی

فون: 021-99206073,99206144

فہرست

عرضِ ناشر

ڈاکٹر نبی بخش خان بلوچ کی شخصیت، علم وادب، ثقافت ولسانیات، اور بھٹائی شناسی میں بیحد ممتاز مقام کی حامل ہیں۔ متذکرہ تمام علمی میدانوں میں انہوں نے تحقیق و تدوین کی جو گرانقدر خدمات سرانجام دی ہیں وہ سندھ کی علمی ادبی تاریخ میں بنیادی حوالہ کے طور پر تسلیم ہو رہی ہیں۔ زیرِ مطالعہ کتاب ''ایام گذشتہ کے چند اوراق'' میں ڈاکٹر نبی بخش خان بلوچ کے علمی اسفار اور علمی یادداشتوں کو یکجا کر کے پیش کیا گیا ہے، جو ایام طالب العلمی اور بعد کے مختلف ادوار میں ڈاکٹر صاحب نے تحریر فرمائے۔

ڈاکٹر صاحب کی یہ تحاریر، پہلے مختلف مجلۂ جات اور کتب میں شایع ہوئی ہیں۔ جن کو مستقل کتابی صورت میں پیش کرنے اور اس پر ضروری ومفید تعلیقات وحواشی تحریر کرنے کی ذمہ داری ڈاکٹر نبی بخش بلوچ انسٹی ٹیوٹ برائے ہیریٹیج ریسرچ کے معزز رکن، ڈاکٹر مولانا محمد ادریس سومرو نے اپنے سرلی، اور اس کو اچھی طرح سے نبھایا۔

کتاب کی ترتیب وتدوین میں ڈاکٹر مولانا محمد ادریس سومرو صاحب کی کاوش کو ہم قدر کی نگاہ سے دیکھتے ہیں، اور ہمیں امید ہے کہ اس کتاب سے ہمارے اہل علم اور دیگر لوگ استفادہ کریں گے۔ بلکہ اس کتاب کے مطالعہ سے ان کا تحصیلِ علم والا ذوق مزید بڑھ جائے گا۔

ہم ڈاکٹر این اے بلوچ انسٹیٹیوٹ کے چیئرمین ڈاکٹر عبدالغفار سومرو، ڈائریکٹر ڈاکٹر محمد یعقوب مغل کے تعاون کے بیحد ممنون ہیں جنہوں نے ڈاکٹر بلوچ کی تیسری برسی 6 اپریل 2014 کے موقع پر یہ کتاب محکمۂ ثقافت کی طرف سے قارئین کی خدمت میں پیش کرنے کا موقع فراہم کیا۔

منظور حسین کناسرو

ڈائریکٹر جنرل

محکمۂ ثقافت، حکومت سندھ

مقدمہ

اپنی علمی ڈائری لکھنا یا تعلیمی آپ بیتی تحریر کرنا، کوئی نئی بات نہیں، قدیم زمانہ سے باذوق لوگ اپنی یادیں محفوظ کرنے یا دوسروں تک پہنچانے کے لیے یا طلبہ کرام کو ترغیب دلانے کے لیے، ایسا کرتے آئے ہیں۔ میری نظر میں اس طرح کی پہلی پہلی آپ بیتی امام شافعی رحمہ اللہ (وفات: ۲۰۴ھ) کی ہے، جو نہایت دلچسپی کے ساتھ پڑھی جاتی ہے اور دنیا کی کافی زبانوں میں اس کا ترجمہ بھی ہوا ہے۔

سب سے ضخیم علمی سفرنامہ حافظ ابوطاہر احمد بن محمد سلفی (ت: ۵۷۶ھ) کا ہے، جو ڈاکٹر شیر محمد زمان کی تحقیق کے ساتھ سب سے پہلے ۱۴۰۸ھ میں ادارۂ تحقیقات اسلامی کی طرف سے شایع ہوا۔ پھر عبداللہ عمر بارودی کی تحقیق کے ساتھ، دارالفکر بیروت سے بھی اشاعت پذیر ہوا۔ صفحات پر مشتمل اس کتاب میں انہوں نے تفصیل کے ساتھ اپنے علمی اسفار بیان کئے ہیں، کہ میں کہاں کہاں گیا، کونسے شہروں کی خاک چھانی، کن کن اساتذہ وشیوخ سے کسب فیض کیا۔

ہم جب تاریخ کی کتابوں کا مطالعہ کرتے ہیں تو ان میں اِن علمی اسفار کی ہزاروں مثالیں سامنے آجاتی ہیں۔ بعض علماء کے سفر کا دورانیہ سات سال پر محیط ہے، تو بعض دس سال اپنے دیار سے باہر رہے۔ بعض نے بیس سال باہر گذارے، حافظ ذہبی نے ''تذکرۃ الحفاظ'' میں لکھا ہے کہ محدث ابن مندہ محمد بن اسحاق (وفات: ۳۹۵ھ) علم کی تحصیل کے لئے مسلسل ۴۵ سال سفر میں رہے۔ ۲۰ سال کی عمر میں باہر نکلے، ۶۵ سال کی عمر میں واپس ہوئے، شادی بھی بعد میں کی، ۸۵ سال کی عمر میں فوت ہوئے، ۱۸۰۰ شیوخ واساتذہ سے علم حاصل کیا۔ علم کی تحصیل کر کے جب واپس ہوئے تو حاصل کردہ علوم پر مشتمل مسودات کی (جو انہوں نے اپنے ہاتھ سے تحریر

فرمائے تھے) چالیس بوریاں ساتھ تھیں۔

اگر صرف ایسے واقعات تحریر کیے جائیں تو کئی مجلدات بن جائیں۔ اگر کسی کو ایسی محیر العقول واقعات مطالعہ کرنے کا شوق ہو تو، ہمارے استاذ الاستاذ شیخ عبدالفتاح ابو غدہ رحمہ اللہ (ت:۱۴۱۷ھ) کی کتاب ''صفحات من صبر العلماء'' کا مطالعہ کرے۔

اِن سندھی علماء کی تعداد بھی اچھی خاصی ہے، جنہوں نے علم حاصل کرنے کے لیے۔ حرمین، عراق، شام و دیگر ممالک کا سفر اختیار کیا۔ تاریخ کے اوراق ان کے علمی کارناموں سے مزین ہیں۔

دسویں صدی ہجری میں مخدوم جعفر بوبکانی (ت:۱۰۰۲ھ) حرمین جا کر حافظ ابن حجر ہیثمی (ت:۹۷۳ھ)، محمد بن ابی الحسن بکری (ت:۹۹۴ھ) اور عبدالقادر مکی سے علم حاصل کرتے ہیں، بارھویں صدی ہجری میں مخدوم محمد حیات سندھی (ت:۱۱۶۳ھ) نے شیخ عبداللہ بن سالم بصری (ت:۱۱۳۴ھ) سے مکہ مکرمہ میں حدیث پڑھی۔ مخدوم ٹھٹوی (ت:۱۱۷۴ھ) مکہ معظمہ میں شیخ عبدالقادر صدیقی (ت:۱۱۳۸ھ) سے علم حاصل کرتے ہیں، پھر اس علمی روداد کو اپنی لاجواب ولازوال تصنیف ''اتحاف الاکابر'' میں قلم بند کرتے ہیں۔

بعض علماء سندھ نے وہاں حرمین میں تعلیمی مسندیں قائم کیں۔ شیخ عبدالحق محدث دہلوی (ت:۱۰۵۲ھ) دہلی سے سفر کر کے، مکہ مشرفہ میں شیخ حمید دربیلی (ت:۱۰۰۹ھ) سے کتب حدیث کا سماع کرتے ہیں، پھر اس چیز کو، اپنی کتاب ''اجازات الحدیث فی القدیم والحدیث'' میں قلم بند کرتے ہیں۔

سلف کی اس تاریخ کو دہراتے ہوئے، تقریباً ۷۵ سال پہلے، سندھ کے فرزند ڈاکٹر نبی بخش بلوچ نے بھی علمی اسفار کا آغاز کیا، جونا گڑھ گئے، علی گڑھ میں رہے، امریکہ چلے گئے، اور علم کی تحصیل کر کے سندھ پہنچے اور حاصل کردہ علم، سندھ والوں کو منتقل کیا۔

اکثر علماء سندھ سے یہ شکایت رہی ہے کہ وہ اپنے علمی اسفار کو قلمبند نہیں کرتے، لیکن اس کے برعکس ڈاکٹر بلوچ صاحب نے اپنے ان اسفار کو مختلف اوقات میں قلمبند کیا۔ اور محفوظ

رکھا، اور نصف صدی کے بعد شایع بھی کروایا۔

۱۔　جونا گڑھ میں اپنے قیام اور علمی تحصیل کے حالات بعنوان ''قاضی احمد میاں اختر مرحوم اور جونا گڑھ کی یاد میں'' مجلۂ تحقیق ۸۔۹ (۹۵۔۱۹۹۴) میں شایع کرائے (ص:۱۶ تا ۲۷)، جس میں کچھ حالات قیام کراچی اور قیام حیدرآباد کے بھی شامل تھے۔

۲۔　علی گڑھ میں قیام کے احوال ''ایامِ علی گڑھ (۱۹۴۱ء۔۱۹۴۵ء) کے عنوان سے، علی گڑھ میگزین، علی گڑھ مسلم یونیورسٹی علی گڑھ کے خصوصی شمارہ (علی گڑھ آئینہ ایام میں) ۹۷۔۱۹۹۵ء میں شایع کرائے (ص: ۲۱۸ تا ۲۳۷)۔

۳۔　امریکہ میں ایامِ تحصیل کا تذکرہ، ان کی کتاب ''مولانا آزاد سبحانی، تحریک آزادی کے ایک مقتدر رہنما (ناشر: ادارۂ تحقیقات پاکستان، دانشگاہ پنجاب، لاہور۔ ۱۹۸۹ء) کے پیش لفظ ''ل'' تا ''ص'' میں موجود ہے۔

۴۔　ترکی میں اپنے علمی اسفار کی روداد، مجلۂ تحقیق (شعبۂ اردو سندھ یونیورسٹی) ۔۷ (۱۹۹۳ء) میں شایع کروائی۔

ان چاروں تحاریر کو ڈاکٹر نجم الاسلام صاحب نے یکجا کر کے، مجلّہ تحقیق شمارۂ خاص ۱۰۔۱۱ (۹۷۔۱۹۹۶ء) میں شایع کرایا تھا۔

۵۔　ڈاکٹر صاحب اپنے اساتذہ میں سب سے زیادہ متاثر علامہ عبدالعزیز میمنی (وفات: ۱۹۷۸ء) سے تھے۔ ان سے انہوں نے بہت کچھ حاصل کیا، وہ ان کے آئیڈیل تھے، ان کے علمی ارشادات کو طالب العلمی کے دور ہی سے قلمبند کرتے رہے۔ جن کو ''محاضراتِ میمنی'' کا عنوان دے کر، مجلۂ تحقیق شمارۂ خاص ۱۰۔۱۱ (۹۷۔۱۹۹۶ء) میں شایع کرایا تھا، جو اس کتاب کا سب سے بڑا حصہ ہے۔

ان میں سے ''علی گڑھ میگزین'' کے علاوہ کتابیں تو میرے سامنے تھیں، البتہ ''علی گڑھ میگزین'' راقم الحروف کے پاس موجود نہیں تھا، جس کی عنایت، ڈاکٹر بلوچ صاحب اور ان کے استاذ میمنی صاحب کے مشہور سوانح نگار، جناب محمد راشد شیخ صاحب نے فرمائی، فجزاہ اللہ خیرا۔

اگر چہ ڈاکٹر نجم الاسلام کو یہ شرف حاصل ہے کہ، ان مضامین کو یکجا کر کے اپنے مجلّہ (تحقیق) میں شایع کیا،

وَلٰکِنْ بَکَتْ قَبْلِی فَهَیَّجَ لِیَ الْبُکَا
بُکَاهَا فَقُلْتَ الْفَضْلُ لِلْمُتَقَدِّمِ

لیکن ضرورت تھی کہ اصل تحریروں کو پھر سے دیکھ کر مستقل کتاب کی صورت میں ترتیب دے کر شایع کیا جائے۔ اور اس میں دو فائدے مدنظر تھے۔

۱۔ مجلۂ تحقیق میں پیش کردہ مواد میں کافی اغلاط کے ساتھ ساتھ کئی سطریں بھی چھوٹی ہوئی پائی گئیں، جن کی اصلاح ضروری تھی، جنہیں اصل مأخذ کو دیکھ کر درست کیا گیا۔

۲۔ کسی ماہنامہ یا سالانہ مجلۂ کے مقابلہ میں مستقل کتاب کی وقعت قارئین کے دلوں میں زیادہ ہوتی ہے۔

ڈاکٹر نبی بخش بلوچ کی ان یادداشتوں میں ہر ایک اپنی جگہ دلچسپ ہے، لیکن جو مزہ اور لطف ان کی ''محاضرات میمنی'' میں ہے، وہ کچھ اور ہے۔ ڈاکٹر صاحب کی علمی ڈائری اگر نہ ہوتی تو علامہ میمنی صاحب کے کچھ گوشہ ہای حیات مخفی رہ جاتے، اس سے ہمیں درس ملتا ہے کہ اہم علمی نکات کو اور علمی شخصیات کی آراء کو محفوظ کرنا چاہیے، جو آگے چل کر تاریخ کا حصہ بننے والی ہیں۔

مجھے یاد ہے جب ۱۹۸۳ء میں احقر راقم الحروف، حضرت علامہ غلام مصطفیٰ قاسمی صاحب (ت: ۲۰۰۳م/۱۴۲۴ھ) کے پاس شاہ ولی اللہ اکیڈمی حیدرآباد پڑھنے جارہا تھا، تو والد محترم مولانا محمد قاسم سومرو نے حکم فرمایا کہ ایک کاپی اپنے پاس رکھ لو اور علامہ قاسمی صاحب کی ہر بات لکھتے جاؤ، پھر میں نے ایسا ہی کیا اور وہ باتیں آج بھی دو کاپیوں کی صورت میں میرے پاس محفوظ ہیں، جو میرے لیے متاع حیات ہیں۔ اور جب بھی ان کا مطالعہ کرتا ہوں تو ایک نیا لطف محسوس ہوتا ہے۔

بہر حال ڈاکٹر نبی بخش بلوچ کی یہ یادداشتیں، مجموعہ کی صورت میں قارئین کی خدمت

میں پیش کی جارہی ہیں۔ بعض قابلِ توضیح مقامات پر راقم نے حاشیہ میں تشریح کی ہے، خصوصاً ''محاضرات میمنی'' کے اندر، کیونکہ اس کا اکثر حصہ ''عربی ادب'' سے وابستہ ہے، جو تشریح وتوضیح کے قابل ہے۔ امید ہے کہ علم وادب کے متلاشی حضرات ان سے بہت کچھ حاصل کریں گے

میں شکر گذار ہوں جناب ڈاکٹر عبدالغفار سومرو صاحب چیئرمین ایڈوائزری کامیٹی ڈاکٹر این اے بلوچ انسٹی ٹیوٹ آف ہیریٹج ریسرچ کا، جنہوں نے مفید مشوروں سے نوازا، تاآنکہ یہ کتاب آپ کے ہاتھوں میں پہنچی۔

(ڈاکٹر) محمد ادریس سومرو
ممبر ایڈوائزری کامیٹی: ڈاکٹر این اے بلوچ
انسٹی ٹیوٹ آف ہیریٹج ریسرچ حیدرآباد
ممبر اسلامی نظریاتی کونسل، پاکستان

۱۹/۵/۱۴۳۵ھ
۲۱/۳/۲۰۱۴

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

(۱) ایام جونا گڑھ

(۱۹۳۸ء۔۱۹۴۱ء)

۱۹۳۸ء تا ۱۹۴۱ء جونا گڑھ میں قیام رہا، کہ وہاں پر بہاء الدین کالج میں بی۔اے کی ڈگری کے لیے داخلہ لے رکھا تھا۔ سندھ کے خشک میدانی ماحول کے برعکس جونا گڑھ کا خطہ سرسبز و آباد تھا، اور شہر تو پہاڑوں کی آغوش میں بسا ہوا تھا، جس کو دیکھتے ہی تعجب اور تحیر کی سی کیفیت طاری ہوتی۔

اس وقت ریاست کے نواب جناب مہابت خان جی تھے۔ برسوں پہلے ریاست کے روشن دماغ وزیر باتدبیر جناب بہاء الدین کی مساعی جمیلہ سے ڈگری کالج قائم ہوا تھا، جس میں طلبہ کے لیے ٹیوشن فیس معاف تھی۔ شہر و ریاست کے ہندو اور مسلمان طلبہ اور طالبات کے علاوہ، ہندوستان کے دور دراز علاقوں سے غریب مسلمان طلبہ وہاں پہنچتے تھے۔ ان کے لیے ہوسٹلوں میں رہنے کا انتظام تھا۔ کالج کی فضا پر امن و پر لطف تھی اور تعلیم پر پوری توجہ دی جاتی تھی۔

پہلے سال کے نصف میں مقابلے کا ایک امتحان ہوا کرتا تھا، جس میں اولیت حاصل کرنے والے کو آٹھ روپے فی ماہ وظیفہ ملتا تھا۔ راقم نے جب یہ وظیفہ حاصل کرلیا، تو سارے مسائل حل ہوگئے۔ کھانے کے انتظام کے لیے ہوسٹلوں میں کلب تھے جو طلبہ خود چلاتے تھے۔ میں نے جب دیکھا کہ دھاندلی ہورہی ہے اور فی ماہ بل، اٹھارہ روپے تک جا پہنچا ہے، تو مروجہ سر رشتے سے قطع تعلق کر کے ایک جداگانہ کلب قائم کرلیا، تاکہ حتی المقدور کم خرچ پر اچھا کھانا مہیا ہوسکے۔ اس مقصد میں کامیابی ہوئی اور فی ماہ بل گیارہ روپے تک جا پہنچا۔ کلب کے ممبروں کے لیے لازمی تھا کہ ہر نئے مہینے کی یکم کو ماہانہ بل کی رقم پیشگی ادا کریں۔ ہم نقد رقم دے کر، کھانے پینے کی اشیاء کافی رعایت سے خرید کرلیتے تھے۔ شہر کے مرکزی دیوان چوک کی بڑی دکانوں سے سودا

لیتے۔ بہترین چاول اٹھارہ روپے فی من، خالص گھی ایک روپے کا ایک سیر تا سوا سیر، دار جیلنگ چائے (سچا نگ پیکو، لیبل والی) نو روپے میں ایک پاؤنڈ وزن کا ڈبہ۔ ہر جمعے کو بریانی اور پیٹھے کا حلوا پکتا تھا۔ بس عیش ہی عیش تھے۔

پہلا ایک ڈیڑھ سال تو زیادہ تر نئے ماحول اور نئی فضا سے مانوس ہونے میں لگا۔ شہر کے گرد شہر پناہ کے طور پر پتھر کی مضبوط دیوار اور شہر کے اندر وسط میں قدیم قلعہ "اوپر کوٹ"۔ یہی جھونا (قدیم) گڑھ تھا، جس پر شہر کا نام پڑا۔

شہر کے جنوب کو واقع اپنے ہوسٹل سے جب ہم شہر کو جاتے تھے تو "کالوا" گیٹ سے داخل ہوتے تھے۔ اس دروازے کا نام "کالوا" ندی (برساتی نالہ) کے نام پر تھا۔ نماز جمعہ کے لیے شہر کے اندر جامع مسجد میں جاتے تھے۔ شہر کے مشرق کی طرف اونچے پہاڑ تھے۔ جن کی وجہ سے ہماری ہوسٹلیں اور شہر کا مشرقی حصہ، صبح کے سات آٹھ بجے تک سایے میں ڈھکے رہتے تھے۔ جون تا ستمبر موسلا دھار بارشیں ہوتی تھیں اور ہم دور سے آبشاروں کو دیکھ کر پہاڑوں پر جا پہنچتے تھے۔ ربڑ کے برساتی جوتے بارہ آنے (آج کے پچھتر پیسے) میں ملتے تھے، جن سے چار مہینے تک گزارا ہو جاتا تھا۔

ہوسٹلوں سے سیدھا مشرق کی طرف داتار پہاڑ تھا، جس کے اوپر جمیل شاہ داتار ٹھٹوی کی چلہ گاہ تھی۔ مجاور سندھی بول لیتے تھے۔ بزرگ جمیل شاہ شہر ٹھٹہ سے بارہ میل جنوب کو "پیر آر" (پیر پٹھا) پر مدفون ہیں، جہاں پر جمیل شاہ گرناری کے نام سے مشہور ہیں، یہاں سے وہ گرنار پہاڑ پر گئے اور پھر داتار پہاڑ پر چلہ کشی کی۔ گرنار پہاڑ، داتار کے شمال کو واقع ہے، جس کے اوپر جین دھرم کے مندر پائے جاتے ہیں۔ گرنار ایک اونچا پہاڑ ہے، اور جو لوگ وہاں جاتے تھے، تو رات کو وہیں پر ٹھہر جاتے تھے۔ مالدار افراد خود کو ڈولیوں میں اٹھوا کر اوپر پہنچتے تھے۔ مگر کالج کے طلبہ کا پہاڑی ٹولہ، پہاڑوں پر چڑھنے اترنے میں اتنا مشاق ہو گیا تھا، کہ ہم ایک ہی دن میں گرنار پہاڑ پر چڑھے اور واپس نیچے اترے۔

شہر جونا گڑھ کے اطراف اور بعض دور دراز علاقوں کو جا کر دیکھتے تھے۔ دھوراجی، راج

کوٹ، منگرول، کتیانہ اور مانا وادر شہروں کے علاوہ ساحل سمندر پر ویراوال بندر پر پہنچے۔ ویراوال سے سومناتھ کو گئے۔ وہاں پر ایک قدیم قبرستان دیکھا، جس میں ایک لمبی قطار ایسی قبروں کی نظر آئی، جن پر پتھر میں تراشے ہوئے گھوڑوں کے سر استوار تھے۔ ان کی نسبت یہ روایت سنی کہ یہ سلطان محمود غزنوی کے لشکر کے گھوڑے تھے، جو یہاں پر مرے اور دفن ہوئے۔ اس طرح کی تگ ودو سے پہلے ایک ڈیڑھ سال میں ہی ہم نے جونا گڑھ شہر اور اطراف کے ماحول کو اپنا لیا تھا۔

سنہ ۱۹۳۸ء کے آخر میں جب ذہن علم وفضل کی راہیں تلاش کرنے لگا، تو بعض قدر آور شخصیتیں نظر آنے لگیں، جن میں بالخصوص قاضی احمد میاں اختر زیادہ نمایاں تھے۔ بعض دوسرے بزرگ جو میری یادوں میں زندہ رہے ہیں وہ یہ تھے: کالج پرنسپل جناب ظہور الدین احمد، جو وضع قطع میں سو فیصد مسلمان اور طالب علموں پر مہربان تھے، فلسفہ اور نفسیات کے عالم تھے اور ان علوم کے حوالوں سے کتابیں لکھی تھیں، جن میں سے ایک دو اس وقت تک چھپ چکی تھیں۔

کالج کے اساتذہ میں سے جناب طاہر علی صاحب ہمیں عربی پڑھاتے تھے اور لائق فائق تھے۔ جناب راؤ صاحب ہندو اساتذہ میں سے ریاضیات کے اچھے استاذ تھے۔ میں نے انٹر میں منطق کے بجائے ریاضیات بطور اختیاری مضمون لے رکھا تھا۔ راؤ صاحب کی ذہانت سے متاثر ہو کر میں نے اس مضمون میں خوب محنت کی اور انٹر میڈیٹ کے امتحان میں سب سے زیادہ نمبر حاصل کیے۔ چنانچہ راؤ صاحب نے ترغیب دی کہ میں ریاضیات میں بی۔اے کروں۔ لیکن ساتھ ہی عربی میں اچھے نمبر آئے اور جناب طاہر علی صاحب کی تلقین نے ان کی طرف کھینچ لیا۔

پروفیسر اوزا صاحب ہمیں انگریزی پڑھاتے تھے۔ معمر مگر شگفتہ طبع تھے اور کلاس میں ان کی اور طلبہ کی آپس میں خوب نوک جھونک رہتی تھی۔ جناب ترمذی صاحب ہمیں فارسی پڑھاتے تھے (جو میرا اختیاری مضمون تھا)۔ ان کا طریقہ تدریس محققانہ اور استفسار پر مبنی تھا۔ چنانچہ مجھے پہلی بار علمی تحقیق وتجسس کی کرنیں نظر آنی لگیں۔ کالج سے باہر اور شہر میں جناب برہانی صاحب، شہر کے رؤسا، سے تھے، یا ریاست کے کسی محکمے کے سربراہ نیلی مسجد (؟) کے پیش امام،

عربی کے فاضل تھے۔ اور میں فراغت میں ان کے ہاں جا کر ابن درید کا مقصورہ پڑھتا تھا۔ ریاست کے لانسرس (گھڑ سوار فوج کا رسالہ) کی مسجد کے حافظ عالم فاضل تھے۔فرخ آباد کے رہنے والے تھے۔ رمضان میں تراویح پڑھاتے تھے اور میں اکثر وہیں نماز کے لیے جایا کرتا تھا۔ شہر کے تجارتی حلقوں میں ہاشم سیٹھ (میمن) ایک معزز شخص تھے اور نواب صاحب کے ہاں مقبول تھے۔ دیوان چوک میں ان کی دکان تھی ، اور میں ان کے ہاں جا کر بیٹھتا تھا۔

فاروقی صاحب کا چھوٹا سا پریس تھا۔قلندر صفت انسان تھے۔ اسلام کی خدمت کا جذبہ رکھتے تھے۔قرآن شریف کے گجراتی ترجمے کو شایع کرنے کا اہتمام کر رہے تھے۔اصل میں جبل پور کی طرف کے رہنے والے تھے۔ میں ان دنوں خاکسار تحریک میں تھا۔ فاروقی صاحب نے میری ہمت افزائی کی۔ میں چاہتا تھا کہ علامہ عنایت اللہ خاں مشرقی کے تصنیف کردہ کتابچے ''اسلام کا عسکری نظام'' کا گجراتی میں ترجمہ کر کے چھپوایا جائے۔ جناب فاروقی صاحب نے میرا یہ مسئلہ حل کر دیا اور ایک ہزار کاپیاں چھاپ کر تقسیم کی گئیں۔ (اس کی پاداش میں، مجھے بی۔اے کے بعد ایم۔اے کے لیے بہاء الدین کالج میں داخلہ نہ مل سکا اور پرنسپل ظہور الدین احمد صاحب کے مشورے سے علی گڑھ مسلم یونیورسٹی جا پہنچا)۔

فتح محمد سندھی صاحب پولیس کے کمانی تھے اور بڑی رعب دار شخصیت کے مالک جناب کامل جونا گڑھی ملک الشعراء تھے۔ جونا گڑھ ریاست کی تاریخ لکھی تھی۔ موسیقی کا صحیح علم رکھتے تھے۔

لیکن سب میں نمایاں اور جاذب شخصیت قاضی احمد میاں اختر صاحب کی تھی۔ اس وقت حسین جمیل جوان لگتے تھے۔ ترکی ٹوپی، شیروانی اور سفید پاجامے میں ملبوس، ایک شاندار وکٹوریا گاڑی میں سوار ہو کر آتے جاتے تھے، جس سے معلوم ہوتا تھا کہ کسی اعلیٰ عہدے پر فائز ہیں۔ معلوم ہوا کہ وہ جونا گڑھ ریاست کے رؤساء اور جاگیرداروں میں سے ہیں۔ راستے میں جب گاڑی میں بیٹھے ہوئے گزرتے تھے، تو ہم ان کو گھور گھور کر دیکھا کرتے تھے۔ ہمیں بتایا گیا تھا کہ قاضی صاحب کا خاندان سندھ سے جونا گڑھ آیا تھا۔شہر کے قاضی واڑے میں ان کی شاندار

حویلی تھی۔

کالج کی عمارت میں داخل ہونے کا دروازہ مشرق سے تھا اور داخل ہوتے ہی سامنے سے کالج لائبریری کا بڑا وسیع ہال تھا۔ البتہ اندر کی جانب دروازے سے متصل بائیں کو ایک کمرہ تھا، جس پر ریاست کے آثار قدیمہ آفس کا سائن بورڈ (Department of Archaeology کچھ مزید الفاظ کے ساتھ) آویزاں تھا۔ میں اکثر اس بورڈ کو دیکھا کرتا تھا، لیکن سمجھ میں نہیں آتا تھا کہ یہ کس کا آفس ہے۔

ایک دن دیکھا کہ چپراسی اس کمرے کا دروازہ کھول رہا ہے۔ اندر دیکھا تو بڑے بڑے سائز کی ضخیم اور مجلد کتابیں خوبصورت الماریوں میں رکھی ہوئی نظر آئیں۔ اسی اثناء میں باہر دروازے کے سامنے ایک وکٹوریا گاڑی آ کر رکی اور قاضی احمد میاں صاحب اترے اور کمرے کے دروازے کی طرف آئے۔ جب دیکھا کہ میں ان کی طرف تعجب سے دیکھ رہا ہوں، تو پوچھا: آپ پڑھتے ہیں؟ کہاں سے آئے ہیں؟ میں نے بتایا کہ میں سندھ سے آیا ہوں۔ پھر مزید شفقت سے پوچھا کہ: آپ یہاں کھڑے ہو کر کیا دیکھ رہے تھے۔ میں نے کمرے کے بورڈ اور کمرے میں اندر کتابوں کی طرف اشارہ کیا اور کہا کہ دیکھ رہا ہوں کہ یہ کمرہ اور یہ کتابیں کس لیے ہیں۔ فرمایا: یہ ریاست جونا گڑھ کے آثار قدیمہ کا محکمہ ہے، اور میں اس کا نگراں ہوں۔

اس مختصر ملاقات کے بعد دوسری بار جب تشریف لائے، تو میں ہمت باندھ کر اندر کمرے میں گیا۔ میرے ہاتھ میں ابن صاعد اندلسی (۱) کی کتاب ''طبقات الامم (۲)'' کا اردو ترجمہ تھا، جو کئی سال پہلے خود قاضی صاحب نے کیا تھا۔ میں نے سلام عرض کیا اور کہا کہ: آپ کا نام نامی دیکھ کر میں نے یہ کتاب لائبریری سے نکلوائی ہے، اور اس کو پڑھ رہا ہوں۔ سن کر خوش ہوئے اور مجھے مزید مطالعے کی ترغیب دی۔

شہر سے مشرق رویہ، گرنار پہاڑ کی طرف جاتے ہوئے، ہم ایک تراشے ہوئے گول پتھر پر کندہ شدہ کتبے دیکھتے تھے۔ ایک دن جب آثار قدیمہ کی آفیس میں تشریف لائے، تو میں نے اس کتبہ کے بارے میں کچھ پوچھنے کا بہانہ بنایا، تا کہ ان سے مل سکوں۔ یہ جان کر خوش ہوئے

کہ مجھے کتبوں سے بھی دلچسپی ہے۔ پھر تفصیل سے سمجھایا کہ: راجہ اشوک کے زمانے کے کتبے ہیں اور بہت ہی اہم ہیں۔ بہرحال شروع میں اس طرح مجھے قاضی صاحب سے ملنے اور متعارف ہونے کے مواقع حاصل ہوئے۔

بہاء الدین کالج جونا گڑھ میں آل انڈیا مشاعرے منعقد کیے جاتے تھے۔ ۱۹۳۸ء سے ۱۹۴۰ء تک دو ایسے مشاعرے منعقد ہوئے۔ دونوں مشاعروں میں جناب جگر مراد آبادی تشریف لائے۔ متوسط قد وقامت، چھوٹی سی کالی داڑھی (سفید ریش نہیں ہوئے تھے) شیروانی اور پاجامے میں ملبوس، سر پر کالی ٹوپی، وضع قطع میں لا ابالی، پان کا اتنا شوق کہ مونہہ کے دونوں اطراف گویا ریشہ آمیز۔ جونا گڑھ کے رؤساء میں سے ایک خوبصورت نوجوان جو اپنا تخلص ''قمر'' کرتے تھے، ان ہی کے ہاں جگر صاحب مہمان ہوتے تھے۔ مقامی شعراء میں سے ریاست کے ملک الشعراء تو حضرت کامل تھے، جو البتہ معمر تھے۔

ایک اعجوبۂ روزگار جونیجہ صاحب تھے، ان کے آباء واجداد کئی پشتوں سے سندھ سے ہجرت کر کے جونا گڑھ میں بس گئے تھے۔ جونیجہ صاحب مقامی جونا گڑھی (گجراتی اردو آمیز) زبان میں خوب شعر کہتے تھے اور اس میں انہوں نے اپنا ایک جداگانہ دیوان بنا رکھا تھا۔ سب کو اپنے یہ اشعار شوق سے سناتے تھے۔ ایک غزل میں آخری قافیہ وردیف والے الفاظ یہ تھے۔۔۔ ہونے تو دو۔۔۔ وہ شستہ اردو میں بھی معیاری شعر کہتے تھے۔

پہلا مشاعرہ جو ہم نے دیکھا وہ کالج کے اندر ہی منعقد ہوا۔ اس میں قاضی احمد میاں اختر صاحب منتظمِ اعلیٰ نظر آئے، بطور والنٹیئر کے میں نے بھی انتظام میں حصہ لیا۔ معلوم ہوا کہ ان مشاعروں کے حقیقی متحرک قاضی صاحب ہی تھے۔ دوسرے مشاعرے کے انتظام میں، میں نے بڑھ چڑھ کر حصہ لیا، اور قاضی صاحب مجھے کام میں مشغول دیکھ کر خوش ہوئے۔ جناب جگر صاحب مہمانِ خاص تھے۔ مصرعِ طرح تھا:

قدرت خدا کی ہے کہ خزاں ہے بہار میں

تقریباً چار گھنٹوں تک محفل جمی رہی۔ حضرت کامل جونا گڑھی کو اور حضرت جگر کو بڑے

احترام سے سنا گیا۔ مجھے اعلیٰ اردو شاعری کی نزاکتوں سے اس وقت تک اتنی آگہی نہ تھی، کہ اچھے اشعار از بر ہو جائیں۔ البتہ جو نیچہ صاحب کی مزاحیہ نظم پر ہم نے خوب قہقہے لگائے۔ مصرعِ طرح کی تضمین کرتے ہوئے انہوں نے یہ شعر پیش کیا اور خوب داد حاصل کی:

بیٹھا ہوا رقیب ہے پہلوے یار میں
قدرت خدا کی ہے کہ خزاں ہے بہار میں

بہر حال ان دنوں جناب قاضی احمد میاں اختر صاحب کی شخصیت جونا گڑھ کی علمی وادبی محفلوں کا مرکز ومحور تھی۔

میں سنہ ۱۹۴۱ء میں جونا گڑھ سے علی گڑھ پہنچا اور مسلم یونیورسٹی میں ایم۔اے کے لیے شعبہ عربی میں داخلہ لیا۔ پروفیسر مولانا عبدالعزیز میمن شعبہ کے صدر تھے۔ جب ان کو معلوم ہوا کہ میں جونا گڑھ سے آیا ہوں، تو قاضی صاحب کے متعلق پوچھا، اور فرمایا کہ: وہ ہمارے دوست ہیں۔ اپنی گفتگو میں میمن صاحب قاضی صاحب کے علم وفضل کی داد دیا کرتے تھے۔ اور یہ سن کر مجھے پہلی بار محسوس ہوا کہ ہم جونا گڑھ میں قاضی صاحب کو دیکھتے تو تھے، لیکن یہ معلوم نہ تھا کہ وہ اتنے بڑے فاضل ہیں، کہ استاذ میمن صاحب جیسے جبل العلم بھی ان کی اتنی قدر کرتے ہیں۔

(اس کا بقیہ حصہ ''ایام کراچی'' اور ''ایام حیدرآباد'' کے عنوان سے آگے آرہا ہے۔)

تعلیقات وحواشی

(۱) ابن صاعد اندلسی، صاعد بن احمد بن عبدالرحمٰن (ت:۴۶۲ھ)

(۲) ''طبقات الامم'' کافی جلدوں میں مطبوع ہے، اس کا فارسی ترجمہ بھی ہوا ہے۔

(۲)

ایام علی گڑھ

(۱۹۴۱ء۔۱۹۴۵ء)

۱۹۳۷ء۔۱۹۴۱ء کے دوران بہاء الدین کالج جونا گڑھ سے بی اے آنرز کیا اور کالج میں پہلی پوزیشن آئی جس پر ایک سو روپیہ ماہوار ''مہابت فیلوشپ'' وظیفہ (بنام نواب مہابت خان جی والی ریاست) کا مستحق ہوا۔ جون ۱۹۴۱ء میں خوشی کے مارے جب کالج پہنچا، تو ایم اے میں داخلے کا دروازہ بند پایا۔ وجہ یہ تھی کہ میں نے کالج اور شہر میں خاکسار تحریک کا اجراء کیا تھا۔ لہٰذا جونا گڑھ کالج میں میرا داخلہ ممنوع ہو گیا تھا۔ البتہ یہ امتناعی حکم صیغۂ راز میں رہا اور پرنسپل جناب ظہور احمد صاحب مجبور تھے۔ وہ مجھے چاہتے تھے، انہوں نے مجھے بلا کر فرمایا کہ بمبئی یونیورسٹی سے تاریخ یا عربی میں ایم۔اے کرنے سے آپ کو اتنا فائدہ نہیں ہوگا، بہتر ہوگا کہ آپ مسلم یونیورسٹی علی گڑھ چلے جائیں۔ مزید تسلی کے لیے ایک طویل سفارشی خط جناب ڈاکٹر ضیاء الدین احمد صاحب کے نام تھا اور جس میں خاص طور پر ذکر تھا کہ میں نے کالج میں فرسٹ اور بمبئی یونیورسٹی میں تھرڈ پوزیشن حاصل کی ہے۔ اس پر خود کو مجبور پا کر بے سروسامانی کی حالت میں بادل ناخواستہ میں نے علی گڑھ کا رخ کیا۔ لیکن وعسیٰ ان تکرھوا شیئا وھو خیر لکم (۱)۔ یہ تبدیلی آئندہ کے لیے نیک فال بنی۔ جنت نشاں جونا گڑھ کو چھوڑا تو ہمت نشاں علی گڑھ کو اپنے سامنے پایا۔

ان دنوں داخلوں کا نظام خوب تھا۔ انتظامیہ کے دفاتر ایس ایس ہال کی دکھنی ونگ کے اوپر تھے۔ داخلے سے وابستہ افسران ایک ہی صف میں بیٹھے ہوئے تھے۔ یکے بعد دیگرے سب کے یہاں سے گزرتے ہوئے ایک گھنٹے کے اندر اندر داخلے کے لوازمات پورے ہو گئے۔ سب

نے ایم۔ اے کے لیے شعبۂ عربی میں اور ایل ایل بی کے لیے شعبۂ قانون میں داخلے لیے۔
رہائش کے لیے مجھے آفتاب ہوسٹل میں ''سنگل روم'' الاٹ ہوا۔ معلوم ہوا کہ بی اے میں نمایاں کامیابی کی وجہ سے مجھے ''اسکالر'' شمار کیا گیا، اور دستور کے مطابق اسکالرز ہوسٹل، یعنی آفتاب ہوسٹل میں کمرہ دیا گیا۔

اس کے بعد پہلی کوہ پیما مشق شروع ہوئی۔ چار پائی شہر سے خرید کر کے لانی تھی اور ساتھ ہی مچھر دانی، کیونکہ ''ہیلی کاپٹر نما'' مچھر برسرِ پیکار تھے۔ شہر جانے کے لیے خاص الخاص سواری یکہ سے آشنائی ہوئی۔ ایک مختصر سا تختہ، جس پر ایک سواری کے بیٹھنے کی جگہ نظر آ رہی تھی، اس پر ہم تین ساتھی شہر سے تین چار پائیاں لاد کر لائے۔ بس یکہ نوجوانان قوم کی جوانی کا پاسبان تھا، کہ شہر کے اونچے ریلوے پل کو پار کرتے ہوئے بال بال بچ جاتے تھے۔۔ بہرحال اپنی خریدی ہوئی چار پائی پر سونے سے یقین محکم ہوا کہ ہم صحیح معنوں میں مسلم یونیورسٹی کے شہری ہیں۔ بعد میں شب تعارف (Introduction Night) کے ہوش ربا ہنگامے نے ہمیں صحیح معنوں میں علیگرین بنا دیا۔

مجھے اپنے گذشتہ کالجوں اور مسلم یونیورسٹی کے انتظامی امور میں فرق نظر آیا۔ ہر ہر محل وموقع پر انتظامیہ کا سامنا کرنا پڑتا تھا۔ یہاں پر انتظامیہ ''پس پردہ'' تھی اور اجتماعی زندگی کی وجہ سے توازن برقرار تھا۔ وہاں پر نصابی تعلیم پر ہی توجہ مرکوز تھی، یہاں پر پڑھنے والوں کے لیے غیر نصابی تربیت کے کئی مواقع موجود تھے۔ ہر ہوسٹل کے اپنے مختصر جلسوں کے علاوہ یونیورسٹی کی سطح پر بڑے بڑے اجلاس منعقد ہوتے تھے۔ مباحثوں، مشاعروں اور کھیلوں کا ایک سلسلہ چلتا تھا، کرکٹ، ہاکی اور فٹ بال کی ٹیموں کو اور خاص طور سے ان کے کپتانوں کو ایک خاص مقام حاصل تھا۔ رائڈنگ اسکول کے کپتان کے لیے جب گھوڑا لایا جاتا تھا، تو لاٹ صاحب کا سماں نظر آتا تھا۔

یونیورسٹی یونین کا الیکشن ایک آزاد ملک کی اسمبلی کے الیکشن کا نظارہ پیش کرتا تھا۔ اور یونین کے صدر نشین کا ایک منفرد مقام تھا۔ البتہ الیکشن میں کامیاب امیدوار اور ان کے ساتھیوں کو

مبارک بادی کے تحائف، اور ہارنے والے کے لواحقین کے لیے مرثیہ خوانی کے کوائف مہیا ہوتے تھے۔ یہ روایت مسلم یونیورسٹی کی خاص الخاص روایت میں سے تھی۔ یونیورسٹی کی حدود سے باہر ایک پرکشش سالانہ نمائش لگتی تھی، جو طلبہ کے لیے خاص طور پر ایک بڑی تفریح گاہ بن جاتی تھی۔ وہاں پر خان کے کباب پراٹھوں کی لذت، اور خواجہ کے شلغم اچار کی خوشبو سے سال بھر کے کیلوریز کا اہتمام ہو جاتا تھا۔

مسلم یونیورسٹی میں آ کر مجھے کلاس روم کے تقدس کا احساس ہوا۔ ایک قابلِ ستائش روایت (جس کا پہلے والی درسگاہوں میں فقدان تھا) یہ تھی کہ کلاس روم میں طلبہ پڑھانے والے اساتذہ کا کلی طور پر احترام ملحوظ رکھتے تھے۔ ہمہ تن گوش ہو کر لیکچر سنا جاتا تھا، اور اگر طوالت اور تکرار کی وجہ سے لیکچر بے مزہ ہوتا، تو بھی ادب واحترام کو ملحوظ رکھتے ہوئے خاموشی اختیار کی جاتی تھی۔ مسلم یونیورسٹی میں آ کر پہلی بار معلوم ہوا کہ پروفیسر کی اہلیت اور قابلیت کا معیار کیا ہوتا ہے۔ اس سے پہلے اچھا پڑھانے والے بعض اساتذہ دیکھے تھے، لیکن ایسے بلند پایے کے پروفیسر نہیں دیکھے تھے، جو اس وقت مسلم یونیورسٹی کے تدریسی اسٹاف کے روشن ستارے تھے۔

شعبۂ عربی کے پروفیسر استاذ عبدالعزیز میمن صاحب بین الاقوامی شہرت کے مالک تھے۔ شعبۂ فارسی کے پروفیسر ہادی حسن صاحب کے متعلق مشہور تھا کہ وہ ایران کے مختلف فارسی لہجوں میں گفتگو کر سکتے ہیں۔ وہ انگریزی میں بھی ایک اچھے خطیب کی حیثیت رکھتے تھے۔ وہ انگریزی میں شکنتلا کا ڈرامہ ڈرامائی انداز میں پیش کر کے مسحور کر دیتے تھے۔ جناب سید ظفر الحسن صاحب اپنے ڈھیلے ڈھالے جبے اور دراز ریش کے ساتھ شعبۂ فلسفہ (ایس ایس ایسٹ) کے سامنے آہستہ آہستہ خراماں ہوتے تھے، تو فلسفے کی جیتی جاگتی تصویر نظر آتے تھے۔ شعبۂ تاریخ کے پروفیسر محمد حبیب صاحب کا نام نامی ہندوستان بھر میں مشہور تھا۔ کچھ پہلے انہوں نے سلطان محمود پر تنقیدی نگاہ سے ایک کتاب لکھی تھی، جس کا شہرہ ابھی باقی تھا۔

ان ہی کی ایماء پر اُن دنوں آل انڈیا ہسٹری کانگریس مسلم یونیورسٹی میں منعقد ہوئی، جس کا اسٹریچی ہال میں شاندار افتتاح ہوا۔ ڈاکٹر تاراچند الہ آباد سے تشریف لائے اور غالباً انہی

نے صدارت فرمائی۔شعبۂ اردو مباحثوں اور مشاعروں کا مرکز بنا ہوا تھا۔مولانا حسرت موہانی اور دوسرے فضلاء اور شعراء تشریف لاتے تھے۔

ان دنوں شعبۂ اردو کے شگفتہ طبع استاد رشید احمد صدیقی صاحب کی مزاح آمیز تحریروں کا چرچا تھا۔شعبۂ طبیعات کے پروفیسر چودھری صاحب صحیح معنوں میں سائنس داں مانے جاتے تھے۔شعبۂ کیمیا کے حیدر خاں صاحب، حیوانات کے بابر مرزا صاحب، نباتات کے ڈاکٹر رفیق احمد خاں صاحب، اقتصادیات کے کریم لودھی صاحب اور جغرافیہ کے ڈاکٹر عباد الرحمٰن خاں (جو یونیورسٹی کے چیف پراکٹر بھی تھے) سب کے سب لائق فائق مانے جاتے تھے۔ان دنوں یونیورسٹی کا انجنیئر نگ کالج زیرِ تعمیر تھا اور جواں سال پروفیسر عبید اللہ خان درانی اپنی خاص مہارت سے مشینوں کو نصب کرنے میں مشغول تھے۔

طبیہ کالج بھی ان دنوں بن رہا تھا اور حکیم عبداللطیف صاحب اس کے سربراہ تھے۔روزانہ باقاعدگی سے درس بھی دیتے تھے اور مطب بھی کرتے تھے۔مجھے بھی ان کی تشخیص اور تجویز کردہ جوارشات سے بہت افاقہ ہوا۔مجھے پہلے دن دیکھ کر فرمایا کہ کل قارورہ لیتے آئیں۔میں اس وقت اس خاص طبی اصطلاح سے بے خبر تھا۔ہوسٹل پہنچ کر احباب سے پوچھنے لگا کہ یہ قارورہ کیا ہوتا ہے۔قارورہ حکیم صاحب کی تشخیص کا جزوِ لاینفک تھا، لہٰذا سب سے یہ فرمائش کیا کرتے تھے۔احباب میں سے کسی نے کہا کہ کہیں آپ حکیم عبداللطیف صاحب کے قارورہ کی تلاش میں تو نہیں؟ میں ان کے مزاحیہ انداز کو سمجھ نہ سکا اور سنجیدگی سے جواب دیا کہ ہاں! انہی نے فرمایا ہے کہ کل قارورہ لیتے آنا۔

اپنی عظمت کے باوجود اساتذہ طلبہ سے کلی طور پر شفقت سے پیش آتے تھے۔میں نے عربی کتاب ''کلیۃ ودمنۃ'' کے اصلی ماخذ پر انگریزی میں ایک لمبا چوڑا مقالہ لکھا اور شعبہ انگریزی کے سربراہ انگریز پروفیسر فیلڈن صاحب کو بھیج دیا کہ یونیورسٹی کے انگلش میگزین میں چھپنے کے لیے منظور کیا جائے۔میں شعبۂ عربی کا طالب علم تھا، تاہم انہوں نے مجھے بلایا، بٹھایا اور بتایا کہ یہ تحقیقی نوعیت کا مقالہ ہے، آپ اس کو اسلامک کلچر (حیدر آباد دکن) یا اور کسی ایسے جرنل میں چھپنے

کے لیے بھیج دیں۔ حقیقت میں یہ کوئی ایسا معیاری مقالہ نہ تھا، اور نہ ہی اس کی انگریزی ہی ٹھیک تھی۔ لیکن یہ نہیں کہا، بلکہ میری ہمت افزائی کی۔

شعبۂ عربی کی کلاس میں استاد میمن صاحب سے معلوم ہوا کہ علی گڑھ کے قدیم قلعے کا کتبہ محفوظ ہے اور اس وقت شعبۂ تاریخ کی دیوار پر نصب ہے۔ چنانچہ شعبۂ تاریخ پہنچا، اور وہاں پر جب کتبے کو حیرت سے دیکھ رہا تھا، تو پروفیسر حبیب صاحب وہاں سے گزرے، اور میرا مدعا سن کر بڑی شفقت سے کتبے کے بارے میں گفتگو کرنے لگے۔ انہوں نے مجھے بٹھایا، اور سندھ کے بعض تاریخی مقامات کے بارے میں سوالات کرنے لگے۔ اتنے شفیق کہ اس ملاقات کے بعد وہ ہمیشہ کے لیے میرے کرم فرما ہو گئے۔

آفتاب ہوسٹل قیام (۱۹۴۱ء۔۱۹۴۲ء) کے دوران، طلبہ کی ہوسٹل لائف سے متعلق مجھے دو باتوں سے آشنائی ہوئی۔ ایک: طلبہ کی یاری دوستی اور تفنن طبع کے لیے آپس میں چھیڑ چھاڑ، جس کو ایکٹوٹی (Activity) کہا جاتا تھا، اور دوم: ان کے علمی ادبی مساعی۔ یہ دونوں مشغلے دو سطحوں پر جاری وساری تھے۔ ایک: لوکل، یعنی ہوسٹل کی سطح پر، اور دوسرے: نیشنل، یعنی یونیورسٹی کی سطح پر۔ شبِ تعارف، یونیورسٹی سطح کی ایکٹوٹی تھی، مگر ہر ہوسٹل میں اس کا اہتمام ہوتا تھا۔ اس طرح بعض صاحبان کو خاص الخاص اسماء اور القاب سے نوازا جاتا تھا، جیسا کہ یونین کے صدر سعید انڈا، جو اس وقت کا ایک مشہور نام تھا، لیکن اس عرف پر سعید صاحب نے کبھی برا نہیں مانا، بلکہ اور زیادہ مشہور و معروف ہو گئے۔ ایکٹوٹی کا جوہر اسی میں تھا کہ قطعاً برا نہ مانا جائے۔ آفتاب ہوسٹل میں ایک نو وارد حسین جمیل طالب علم، بڑے ناز و انداز کے عادی تھے اور بہت کچھ بنتے تھے۔ یار لوگوں نے ان کا نام ''ہیٹر'' (Heater) رکھ چھوڑا تھا، لیکن یہ کوڈ ورڈ، ہوسٹل تک محدود تھا۔

علمی و ادبی مساعی کا مرکز آفتاب ہوسٹل کی شمالی ونگ کے اوپر وارڈن کا کوارٹر تھا۔ ان دنوں اس کے روح رواں خورشید الاسلام صاحب تھے، جن کا تعلق شعبۂ اردو سے تھا، اور غالباً ایم. اے کر چکے تھے۔ ان کے ہاں شعر و ادب کی محفلیں ہوتی تھیں۔ شعبۂ اردو سے ایک شاندار

میگزین شائع ہوا تھا، جو خورشید الاسلام صاحب اپنے ساتھ لائے اور جس پر ایک نشست میں گفتگو ہوتی رہی۔

آفتاب ہوسٹل میں بمشکل ایک سال میں مشرّف بشرف ''اسکالر'' رہا۔ مجھے سنگل روم میں تنہائی محسوس ہوتی تھی۔ دوسری تکلیف کھانے کی تھی۔ میں دیر تک شعبۂ عربی میں بیٹھ کر پڑھتا تھا، اور پیچھے بیرا کھانا کمرے میں چھوڑ کر چلا جاتا تھا، جو سردیوں کے موسم میں یخ ہو جاتا تھا اور کھایا نہیں جا سکتا تھا۔ یہ یونیورسٹی کا جمہوری کھانا تھا جو محمود و ایاز کے لیے یکساں تھا۔ بعض طلبہ مل کر انگیٹھیاں رکھتے تھے، اور عطا شدہ رزق کو گرم کر کے کھانے کے قابل بناتے تھے۔ یا پھر اپنی ایڈیشنل ڈشز (Additional Dishes) پکاتے تھے۔ اس مشق سے بعض تو ڈگری حاصل کرنے کے ساتھ ساتھ اچھے بھلے باورچی بن جاتے تھے۔

بہر حال میری درخواست پر دوسرے سال مجھے پکی بارک (ایس ایس ایسٹ کمرہ نمبر ۱۶) میں جگہ مل گئی، جہاں سندھ کے غلام مصطفیٰ شاہ پہلے سے مقیم تھے۔ ہم نے مل کر انگیٹھی خرید لی۔ کھانا گرم کرنا میرے ذمے تھا اور بیرے کو بلا کر کھانا منگوانا ان کے ذمے۔ مگر وہاں کے بیرے طلبہ سے زیادہ ہی خوددار تھے اور اپنی مرضی سے ہی کام کرتے تھے۔ ہمارا بیرا مجید تھا۔ کسی نزدیکی گاؤں کا رہنے والا۔ دھوتی لنگوٹی باندھتا تھا اور سر پر گاندھی جی والی سفید ٹوپی اوڑھتا تھا۔ غلام مصطفیٰ شاہ نے ان کو ''خان بہادر'' کے لقب سے نوازا، اور بجائے ''مجید'' کے ان کو ''خان بہادر'' کہہ کر بلایا جاتا تھا۔ تاہم وہ اپنے کردار کے ساتھ اپنی رفتار کا بھی خود ہی مالک تھا۔ غلام مصطفیٰ جب ان کو چیخ کر بلاتے تھے، اور پوری فضا ''خان بہادر'' کی آواز سے گونج اٹھتی تھی، تب جا کر کہیں مجید میاں نمودار ہوتے تھے۔

مسلم یونیورسٹی کی ایک اہم اور قابل فخر روایت جو اس وقت تک چلی آ رہی تھی، وہ یہ تھی کہ مختلف مکاتب فکر کے زعماء کا احترام کیا جائے۔ لہٰذا علماء و فضلاء اور سیاسی رہنماؤں میں سے اگر طلبہ کسی کو مدعو کرتے تو اس پر کوئی پابندی نہیں ہوتی تھی۔ اس وقت طلبہ میں مسلم لیگ کے رہنما قائداعظم محمد علی جناح صاحب کی مقبولیت کا رجحان بڑھ رہا تھا۔ خاکسار تحریک بھی مقبول تھی۔

کچھ طلبہ اور اساتذہ نیشنل کانگریس کے حامی تھے۔ ان رجحانات کے باوجود طلبہ میں کوئی تفریق یا تنازع نہیں ہوا۔

میں خاکسار ہونے کے باعث جونا گڑھ سے نکلا تھا، لہٰذا مسلم یونیورسٹی میں پہنچتے ہی خاکسار جماعت کا سرگرم کارکن بن گیا۔ اس وقت یو۔ پی کے ایک معزز پٹھان خاندان کا لائق فائق فرزند اور یونیورسٹی کا طالب علم محترم محمد افضل خان، یونیورسٹی کے خاکساروں کے سالار اعلیٰ تھا اور یونیورسٹی کے چاق و چوبند دستوں کی پریڈ کا سلسلہ جاری تھا۔ کوئی ممانعت یا پابندی نہیں تھی۔ یونیورسٹی کے خاکساروں کا ایک بڑا سہ روزہ اجتماع فوجی کیمپ کی صورت میں، کول کے قدیم قلعے (یونیورسٹی کے شمال میں) ہوا، جو فوجی نظم و نسق کا ایک کامیاب مظاہرہ ثابت ہوا۔ جس سے حوصلے بڑھے۔ مسلمانان ہند میں عملی زندگی کے ابھرتے ہوئے سورج کی کرنیں نظر آنے لگیں۔

خاکساروں کے قائد علامہ عنایت اللہ خاں المشرقی نے مسلم لیگ کے مقتدر رہنما جناح صاحب کو اشتراک عمل کی پیش کش کی۔ ادھر جناح صاحب جب مسلم یونیورسٹی میں تشریف لائے تو خاکسار طلبہ نے ان کو اسٹریچی ہال کے سامنے سلامی دی، لیکن سامراجی طاقت بھی سرگرم عمل تھی۔ خاکساروں پر برطانوی حکومت نے تشدد کیا اور لاہور میں ان پر گولی چلی۔ پھر بھی تحریک کی مقبولیت بڑھتی رہی، تا آنکہ یہ وحشت ناک خبر آئی کہ کسی خاکسار نے بمبئی میں جناح صاحب پر حملہ کر دیا ہے (۲)۔

ہم سب کو یقین تھا کہ کوئی خاکسار ایسی حرکت نہیں کرسکتا اور یہ کام حکومت کے کسی ایجنٹ کا ہے، جو ہوسکتا ہے خاکساروں کی صف میں شامل ہو۔ ایسی بگڑتی ہوئی فضا میں مسلم یونیورسٹی میں زعماء کے عزت و احترام کی روایت قائم رہی۔ یونیورسٹی یونین کے جلسوں میں تو خاص طور پر اس روایت کو ملحوظ رکھا جاتا تھا۔ چنانچہ (غالباً) بمبئی کے کامیاب مسلم لیگی اجلاس کے بعد جب نواب زادہ لیاقت علی خان صاحب کو یونین کی طرف سے مدعو کیا گیا، تو مسلم لیگی، خاکسار اور دوسرے سب طلبہ نے مل کر ان کا یونین ہال میں خیر مقدم کیا۔

نوابزادہ صاحب کے ساتھ مولانا عبدالحامد خاں بھی تشریف لائے، جنہوں نے اپنی تقریر میں خاص طور پر خاکساروں کو کڑی تنقید کا نشانہ بنایا۔ لیکن ان کو خاموشی سے سنا گیا، تا آنکہ انہوں نے جوش میں آ کر کہا کہ علامہ مشرقی انگریز کے جاسوس ہیں۔ ایسا الزام مسلم یونیورسٹی کے منافی تھا، چنانچہ اس پر راقم نے پائنٹ آف آرڈر (Point of Order) اٹھایا، لیکن صدر نشیں (طالب علم) نے ،اور رول (Over Rule) کر دیا کہ اوپر گیلری میں سے، پائنٹ آف آرڈر نہیں اٹھایا جا سکتا۔ اس پر نیچے ہال میں بیٹھے ہوئے طلبہ میں سے بعض نے یکساں طور پر پائنٹ آف آرڈر، اٹھائے جو صدر نشین نے قبول کر لیا اور طالب علم غلام محمد بھٹی سے کہا کہ وہ آ کر اپنا نقطۂ نظر پیش کریں۔ وہ اپنی جگہ سے اٹھ کر اسٹیج پر پہنچے اور کہا کہ ہمارے معزز مہمان نے جو تنقید کی، اس پر ان پر کوئی حرف نہیں آتا، لیکن ایک معزز مسلم رہنما (علامہ مشرقی) پر جو انہوں نے الزام لگایا ہے وہ ہماری روایات کے خلاف ہے۔ مولانا اپنے الفاظ واپس لیں اور معذرت کریں۔ سب طلبہ نے تائید کی اور مولانا نے معذرت کے الفاظ دہرائے۔ یہ ایک مثال ہے اس قابل فخر روایت کی، جو اس وقت تک چلی آ رہی تھی۔

کچھ بعد میں مجھے یونیورسٹی میں خاکساروں کے سالار اعلیٰ کے فرائض سرانجام دینے پڑے۔ ان دنوں علامہ صاحب شہر علی گڑھ تشریف لائے۔ میں ان سے ملا، اور بتایا کہ مسلم یونیورسٹی میں مختلف مکاتب فکر کے احترام کی روایت چلی آ رہی ہے، اور میں مسلم لیگی اور خاکسار طلبہ میں یکجہتی اور اشتراک عمل ہوں، علامہ صاحب سن کر مطمئن ہوئے۔

خاکسار تحریک کے سلسلے میں ایک اور بات بیان کرنا ضروری سمجھتا ہوں۔ ان دنوں یو۔ پی کے خاکساروں میں سے بعض دانشور، تحریک میں فکری انقلاب لانا ضروری سمجھتے تھے۔ ان میں جناب پروفیسر کرار حسین صاحب اور جناب اختر حمید صاحب پیش پیش تھے۔ کرار صاحب میرٹھ کالج میں انگریزی کے استاد تھے۔ اختر حمید خاں (آئی سی ایس) بنگال سروس میں ڈپوٹی کمشنر تھے، جہاں سے استعفاء دے کر علی گڑھ آ گئے تھے اور انہوں نے خدمت خلق کے ذریعے محنت کش طبقے میں رہ کر، ان کو سر بلند کرنے کا تہیہ کر رکھا تھا۔ ذاتی طور پر میرے دل میں ان

دونوں صاحبوں کے لیے بے حد عزت و محبت تھی۔ اختر حمید خاں صاحب زمین پر بیٹھ کر تالے بناتے تھے۔ کرار صاحب کبھی کبھار علی گڑھ آ جاتے تھے۔

ان کی سربراہی میں ماہانہ انگریزی اخبار Radiance کا اجراء ہوا، اور کرار صاحب اپنے قلم سے اس میں خوب سے خوب تر اسلامی فکری اداریے لکھتے تھے۔، جب میں یونیورسٹی میں خاکساروں کا سالارِ اعلیٰ تھا، تب انتظامیہ کی طرف سے کوئی پوچھ گچھ نہیں ہوئی۔ طلبہ کے لیے ذہنی و فکری آزادی اور مثبت سیاسی عمل کے دروازے کلی طور پر کھلے ہوئے تھے۔ البتہ انگریز سرکار کے جاسوسوں نے مجھے گھیر لیا اور میرا سایہ بن گئے۔

خاکسار تحریک میں حصہ لینے، بنوٹ کھیلنے، تیرنے اور احباب کے ساتھ گھومنے کے ساتھ ساتھ کلاسوں اور کتابوں پر میری پوری توجہ رہی۔ بعض اساتذہ کے لیکچر پر از معلومات ہوتے تھے۔ شعبۂ قانون کے سربراہ جناب خسرو صاحب، رومن لا پڑھاتے تھے۔ اور اپنے اسلوب و اظہار میں بے مثال تھے۔ وہ کلی طور پر بہرے تھے، لہٰذا اس طرح سہل انداز میں مسائل کو پیش کرتے اور سمجھاتے کہ تعقید لفظی و معنوی کا شائبہ نہ رہے۔ ان سے سوال کرنے کی نوبت ہی پیش نہیں آتی تھی، کیوں کہ ان کے طریقۂ اظہار سے مسائل خود بخود حل ہو جاتے تھے۔ طریقہ تعلیم و تعلم کے اعتبار سے وہ ایک باکمال استاد تھے۔

سید محمود رضا صاحب انڈین پینل کوڈ پڑھاتے تھے اور کچھ مزاحیہ انداز میں اشاروں کنایوں سے کلاس کو تفریح گاہ بنا دیتے تھے۔ منظور صاحب قانونِ شہادت پڑھانے میں صنعت تکرار سے کام لیتے تھے اور توضیحات کو بار بار دہراتے تھے، اتنا کہ پھر کمرے میں جا کر پڑھنے کی ضرورت نہیں پڑتی تھی۔ البتہ عبدالسلام صاحب غالباً قانون عہد و پیمان (کانٹریکٹ ایکٹ) پڑھاتے تھے اور سست رفتار تھے۔ تاہم اساتذہ کے ادب و احترام والی روایت برقرار رکھتے ہوئے، ان کو صبر کے ساتھ سنا جاتا تھا۔

شعبۂ عربی کے صدر عالی قدر پروفیسر استاذ عبدالعزیز المیمنی (میمن صاحب) تھے جو علم و فضل کے روشن مینار تھے۔ وہ درسی کتاب کی عبارت تو سمجھاتے، لیکن اس سے آگے بڑھ کر

اس عبارت کے ماخذ اور سیاق وسباق بیان فرماتے۔ اگر درس میں کہیں کوئی شعر آجاتا تو شاعر کے دیوان کا حوالہ دے کر، اس سلسلے کے سب اشعار پڑھ کر سناتے۔ ایک بار انہوں نے رؤبۃ بن العجاج (۳) کا پورا ارجوزہ پڑھ کر سنا دیا۔ ان کے لیکچر کا انداز محققانہ ہوتا تھا، ٹیکسٹ تک محدود رہنے کے بجائے، وہ وسیع معلومات مہیا کرتے تھے۔

شعبۂ عربی میں ہمارے دوسرے استاذ مولانا بدرالدین علوی تھے، جو قدیم روایتی انداز میں پڑھاتے تھے۔ ڈاکٹر عابد علی اوکسفورڈ (Oxford) کے ڈی فل تھے، اور انگریزی میں لیکچر دیا کرتے تھے۔ اس وقت سید محمد یوسف کو ڈاکٹری کی ڈگری مل چکی تھی، انہوں نے استاد میمنی کی رہنمائی میں اُموی دور کے مشہور جرنیل مہلب بن ابی صفرہ (۴) پر مقالہ لکھا تھا۔ خورشید احمد فارق، ڈاکٹریٹ کے لیے ''زیاد ابن ابیہ'' (۵) پر مقالہ مرتب کر رہے تھے۔ شعبۂ عربی میں کلی طور پر علمی ماحول تھا، اور ہم نے بہت کچھ حاصل کیا۔ اس وقت میرا مدعا وکیل بننے کا تھا، تاکہ آزادانہ طور پر قومی آزادی کے لیے کام سکوں۔ لہٰذا شعبۂ قانون کے نصاب پر کچھ زیادہ توجہ دی۔ ایم اے کے مضامین کو بھی کافی کچھ سمجھنے کی کوشش کی، مگر ایم اے فائنل وایوا (Viva) میں مجھے اپنی بے بضاعتی کا احساس ہوا۔

مولانا سید سلیمان ندوی صاحب ممتحن تھے۔ مجھے ایک عبارت پڑھنے کو کہا جس میں لفظ ''سکان'' آیا تھا۔ سید صاحب نے ''سکان'' کے معنی پوچھے۔ میں نے اس لفظ کے معنی پر کبھی سوچا بھی نہیں تھا، کیوں کہ سندھی میں بھی سکان ہی کہا جاتا تھا۔ میں نے بتایا کہ یہ لکڑی کا ایک آلہ ہے، جس سے کشتی کا رخ موڑ لیا جاتا ہے۔ لیکن سید صاحب نے فرمایا کہ اس کو کیا کہا جاتا ہے؟ میں اتنا کنفیوز ہو گیا کہ انگریزی میں بھی نام بتا نہ سکا۔ اردو لفظ سے تو میں نابلد تھا۔ سید صاحب نے شفقت سے کہا کوئی بات نہیں۔ اس کو ''پتوار'' کہا جاتا ہے۔

اس تجربے کے بعد مجھے بین خوف ورجا، امتحان کے نتیجے کا انتظار رہا۔ ایل ایل بی کا نتیجہ فرسٹ ڈویژن میں آیا، تو وکیل بننے کے امکانات روشن ہوئے۔ مگر بعد مین ایم اے کا نتیجہ، فرسٹ ڈویژن، فرسٹ میں آیا، جس نے آئندہ کا رخ بدل دیا۔ اس وقت ایسی کامیابی پر

ڈاکٹریٹ کی ڈگری حاصل کرنے کے لیے تین سال تک پچاس روپے ماہوار وظیفہ ملتا تھا۔ استاد میمن صاحب نے خوش ہوکر فرمایا کہ خورشید احمد صاحب اپنا کام مکمل کرنے والے ہیں، اور اب آپ کی باری ہے۔ آپ رک جائیں اور پی ایچ ڈی کے لیے ''السند تحت سیطرۃ العرب'' پر کام کریں۔ میں نے آمنا وصدقنا کہہ دیا۔ اس طرح مسلم یونیورسٹی میں تقریباً تین سال (۱۹۴۳ء-۱۹۴۵ء) رہنے کا موقع ملا۔

اس پورے عرصے میں یونیورسٹی کے اندر میرے شب و روز کی زندگی کا بڑا حصہ مطالعے میں گذرا، اس قدر کہ گویا دنیا و مافیہا سے کنارہ کشی کرلی تھی۔ میرے اس مطالعے میں قبلہ استاد المیمنی سے استفسار اور استفادہ کو اولیت حاصل تھی۔ لہٰذا صبح و شام ان سے ملنے کے لیے وقت نکالتا رہتا تھا۔ البتہ جب بعض زعماء باہر سے آتے اور یونیورسٹی میں خطاب فرماتے، تو ان کو سننے کے لیے ضرور جایا کرتا تھا۔ چنانچہ مولانا حسرت موہانی، مولانا سعید احمد اکبرآبادی، علامہ سید سلیمان ندوی اور نواب بہادر یار جنگ کو سننے کا شرف حاصل ہوا۔ نواب صاحب موصوف اردو میں خطابت کے بادشاہ تھے۔ انہوں نے اپنے خطاب میں خاص طور پر کشمیر کا ذکر کیا، اور اس حوالے سے جب کشمیریوں کے حسن کو اپنے چند جملوں کا موضوع بنایا، تو بیان و معانی کی لطافت سے مسحور کردیا۔ رحمہ اللہ

مطالعے اور تحقیق کے سلسلے میں مجھے استاذ محترم سے قریب تر ہونے کا شرف حاصل ہوا اور انہوں نے اپنی نگاہ شفقت سے نوازا۔ ڈپارٹمنٹ میں خواہ گھر پر جب ضرورت ہوتی تھی، ان سے جاکر مستفید ہوتا تھا۔ میرے لیے وقت نکالتے تھے، حالانکہ ان دنوں وہ خود تحقیق و تصنیف میں مشغول تھے۔ ایک دن بغیر پیشگی اطلاع کے ''میمن منزل'' پہنچا، اور نوکر کو اطلاع دی، تو اندر اپنے کتب خانے میں بلالیا۔ تہبند باندھے ہوئے چٹائی پر بیٹھے تھے، اردگرد کتابیں بکھری ہوئی تھیں اور حوالے تلاش کررہے تھے۔ ان دنوں وہ بغدادی کی کتاب ''خزانۃ الأدب'' پر حواشی لکھ رہے تھے۔ دو تین جلدیں پہلے چھپ چکی تھیں۔ فرمایا کہ آپ ہر وقت آسکتے ہیں، لیکن بہتر ہوگا کہ روزانہ شام کو آئیں، اور ٹہلنے میں میرے ساتھ ہوجائیں، پھر اس وقت جو کچھ پوچھنا چاہیں پوچھ

لیں۔

استادمحترم ہر شام پابندیٔ وقت سے نابیناؤں کے اسکول، نابینا ماسٹر سعید احمد کی بیٹھک پر آجاتے تھے، جہاں پر دو ایک اور اصحاب بھی پہنچ جاتے تھے، اور حقے کا دور چلتا تھا۔ استاذ حقے کے دلدادہ تھے۔ گھر پر حقہ تیار رہتا تھا، اور وہ خود بڑی احتیاط سے حقہ تیار کرتے تھے۔ نابینا ماسٹر کے ہاں شام کو حقہ پیتے تھے، لیکن وہ ان کے اپنے معیار کا نہیں تھا۔ ان قریبی صحبتوں میں استاذ کی گفتگو سن کر محسوس ہوا کہ وہ شگفتہ طبع کے مالک تھے، اور ان کی غیر رسمی گفتگو میں اعلیٰ ظریفانہ انداز ہوتا تھا۔

ایک دن بدستور ہم قلعے کی طرف والے راستے پر جارہے تھے، شدید گرمی کا دن تھا۔ شیروانی کے نیچے پاجامہ پسینہ پسینہ ہورہا تھا۔ اس وقت ہمارے سامنے ایک لالہ جی جارہے تھے اور دھوتی لنگوٹی باندھے ہوئے تھے۔ دھوتی کا کنارہ ایک ہاتھ میں دبا رکھا تھا اور ہاتھ کو ہلاتے جاتے تھے، جس سے دھوتی کے اندر کافی کشادگی آجاتی تھی۔ اس پر میں نے استاذ سے عرض کیا کہ قبلہ! پاجامے کی نسبت دھوتی کافی کھلی ہوئی اور ہوادار ہے۔ جواب میں تصدیق فرماتے ہوئے میسون بنت بحدل (۶) (اعرابن بیوی، جس کو امیر معاویہ رضی اللہ عنہ نے محل میں آرام سے رکھا تھا، لیکن وہ اپنے بادیہ نشینوں کے ہوادار گھروں کو یاد کرتی تھی) کا مندرجہ ذیل شعر پڑھ کر کہا کہ یہ میسون بنت بحدل کے اس گھر کی مانند ہے، جس میں ہوائیں چلتی رہتی ہیں۔

لَبَیْتٌ تَخْفِقُ الْأَرْیَاحُ فِیْهِ
أَحَبُّ إِلَیَّ مِن قصرٍ منیف (۷)

مطالعے اور تحقیق کے سلسلے میں مجھے استاد المیمنی سے دو طرح کی رہنمائی حاصل ہوتی تھی۔ ایک تو وہ خود ہر مسئلے میں رہنمائی فرماتے تھے۔ دوم یہ کہ میری گذارش پر دوسرے فضلاء کو سفارشی خط لکھ کر دیا کرتے تھے کہ مری مدد فرماویں۔ خود اپنی طرف سے ان کی کرم فرمائی تھی کہ انہوں نے مجھے اجازت دے رکھی تھی اور چابی میرے حوالے کردی تھی کہ میں ان کے ذاتی کتب

خانے کو دیکھوں اور جی بھر کر استفادہ کروں۔ بات یہ تھی کہ السند والہند کے متعلق مجھے تاریخی کتابوں کے علاوہ دوسری کتابوں سے بھی حوالے ملنے لگے۔ اس پر تہیہ کرلیا کہ لٹن لائبریری میں جو بھی عربی و فارسی کتابیں محفوظ ہیں، ان سب کو دیکھوں گا۔ بہر حال جو کتاب دیکھ لیتا تھا اس کے خاتمے پر باریک حروف میں ''عثمان السندی'' لکھ دیا کرتا تھا تاکہ دوبارہ دیکھنے کی زحمت نہ ہو۔ استاذ نے دو تین کتابوں پر ایسے اندراجات دیکھ لیے تھے اور مطمئن تھے کہ میں کام کر رہا ہوں۔

باہر کے فضلاء سے استفادہ کرنے میں استاذ محترم نے میری بہت کچھ مدد فرمائی۔ قاضی احمد میاں اختر (جونا گڑھ) ڈاکٹر عمر بن محمد داؤد پوتہ (سندھ) پروفیسر محمد شفیع (لاہور) اور ڈاکٹر عبدالستار صدیقی (الہ آباد) کو میرے سلسلے میں خطوط لکھے۔ انہوں نے رامپور کے شاہی کتب خانے کو دیکھنے کی ترغیب دی اور وہاں کے مہتمم جناب امتیاز علی صاحب عرشی کو ایک خاص خط لکھا، جس پر نہ صرف مجھے کتب خانے سے استفادہ کرنے کی اجازت ملی، بلکہ معزز مہمان کے طور پر نواب صاحب کے شاہی مہمان خانے میں رہائش کا انتظام بھی ہوا۔ عرشی صاحب کی رہنمائی میں کتب خانے سے بہت کچھ استفادہ کیا۔ ان دنوں ایک مقتدر شیعہ عالم سید رضی لکھنوی بھی شاہی مہمان خانے میں مقیم تھے اور تفسیر قرآن لکھ رہے تھے۔ فلسفہ اور منطق میں یگانہ تھے۔ انہوں نے مجھے وحدۃ الوجود اور وحدۃ الشہود کے مفاہیم سمجھائے اور خوب سمجھائے۔

جب بھی کوئی فاضل محقق مسلم یونیورسٹی میں آتا تھا، اور استاذ المیمنی سے ملتا تھا، تو مجھے بلا لیتے تھے اور میرا تعارف کروا کر مجھے ان کی خدمت میں لگا دیتے تھے، تاکہ مجھے ان سے استفادہ کرنے کا موقع ملے۔ اس طرح ڈاکٹر عبدالستار صدیقی اور ڈاکٹر زاہد علی سے (جو حیدر آباد دکن سے تشریف لائے تھے) قریبی صحبتوں میں استفادہ کر سکا۔ ڈاکٹر زاہد علی نے ان دنوں اسماعیلی مذہب کی حقیقت کے موضوع پر ایک ضخیم کتاب مرتب کر لی تھی، جس کا مسودہ وہ اپنے ساتھ لائے تھے۔ میں چوتھی صدی ہجری کے ''السند'' میں فاطمی دعوت کو سمجھنا چاہتا تھا۔ میری استدعا پر ڈاکٹر زاہد علی نے وہ مسودہ میرے حوالے کر دیا، جو تین روز تک میرے پاس رہا۔ اس میں فاطمی فقہ کی بعض قلمی اور نایاب کتابوں میں سے نقل کیا گیا مواد تھا، جس میں تاویل پر بعض انوکھی عبارتیں

موجود تھیں۔ میں نے کافی کچھ مواد نقل کیا، جو ابھی تک میرے پاس محفوظ ہے۔

غالباً ۱۹۴۴ء میں بنارس ہندو یونیورسٹی میں آل انڈیا اورینٹل کانفرنس کے انعقاد کی خبر آئی اور مسلم یونیورسٹی سے شعبۂ عربی کو اس کانفرنس میں شرکت اور نمائندگی کا شرف حاصل ہوا۔ استاذ المیمنی اور ان کے ساتھ ڈاکٹر سید محمد یوسف کے جانے کا فیصلہ ہوا، تو میں نے گذارش کی کہ کچھ طلبہ بھی ساتھ ہو جائیں، تا کہ ان کو بنارس ہندو یونیورسٹی جیسی بڑی درسگاہ کو دیکھنے کا موقع مل سکے۔ اس گذارش کو استاذ محترم نے بڑی شفقت سے مان لیا، اور میرے علاوہ تین اور طلبہ کے لیے سفارش کر دی، جو یونیورسٹی سے منظور ہو گئی۔

جب کالی شیروانیوں میں ملبوس یہ قافلہ بالآخر ہندو یونیورسٹی پہنچا، تو سب کی نگاہیں ہم پر مرکوز ہو گئیں۔ ہمیں ایک ہوٹل کے وسطی ہال میں گراؤنڈ فلور پر ٹھہرایا گیا۔ ہم نے باجماعت نماز ادا کی تو دوسری منزل پر رہنے والے طلبہ اوپر بالکنی میں آکر دیکھنے لگے۔ عشاء کے وقت جب ہمارے ایک نڈر ساتھی غلام محمد بھٹی نے بلند آواز سے اذان دے ڈالی، تو بالکنی میں مجمع اور بڑھ گیا، لیکن ہوسٹل کے ہندو طلبہ نے بڑے تحمل کا مظاہرہ کیا، کہ چار روز تک وہ بھٹی صاحب کی اذانیں بہ آواز بلند سنتے رہے اور انہوں نے کسی قسم کی مزاحمت نہیں کی۔ دن کو کانفرنس کی نشستوں میں شمولیت اور شام کو شہر کی سیر۔ الاستاذ المیمنی نے غالباً المفضل الضبی کی مشہور تالیف ''المفضلیات'' پر اپنا بصیرت افروز مقالہ پیش کیا تھا، جس سے یہ انکشاف ہوا کہ اس کتاب میں شامل نظمیں غالباً امام ابراہیم باخمرا نے منتخب کی تھیں۔

میں نے ہندو یونیورسٹی کے استاد لالہ مہیش پرشاد، صدر شعبۂ عربی و فارسی و اردو سے بھی استفادہ کیا۔ جو عربی میں مولوی فاضل تھے۔ اور عرب سیاحوں کی تصانیف سے بخوبی واقف تھے۔ انہوں نے مہربانی فرما کر سلیمان تاجر کے سفر نامے کا پیرس میں چھپا ہوا ایڈیشن عاریۃً میرے حوالے کر دیا، جو میں اپنے ساتھ لایا اور نقل کر کے اصل کتاب انہیں واپس بھیج دی۔

کانفرنس کے دوران ایک دن ہم نے ''صبح بنارس'' دیکھنے کی ٹھان لی۔ ایک دن پہلے ہوسٹل سے رکشاؤں کی سواری اور پھر گنگا ندی پر دو چھوٹی کشتیوں کی سواری کا انتظام کر لیا۔

دوسرے دن علی الصباح بڑے جگن ناتھ مندر کے گھاٹ پر پہنچے، جہاں پر بھٹی صاحب نے اپنے معمول کے مطابق اذان دے کر بڑے اطمینان اور دل جمعی سے نماز فجر ادا کی۔ پھر کشتیوں میں بیٹھ کر گنگا کے وسط تک گئے، جہاں سے مغرب کنارے شہر بنارس کا ہوش ربا خط سمائی Sky-Line نظر آنے لگا، اور سورج طلوع ہوا تو شہر کی گنجان آبادی اور عمارت کے نقوش نمودار ہوئے۔ ہم اس شعر کو تھوڑی ترمیم سے دہراتے رہے کہ

ذرا اس سمت میں دل سیر کر لے
دوبارہ پھر قدم آئے نہ آئے

بنارس جانے سے کافی عرصہ پہلے استاذ سے میں نے گذارش کی کہ آپ تو حبیب الرحمان خاں شروانی کے کتب خانے کا اکثر ذکر فرماتے تھے۔ اگر ممکن ہو تو میں وہاں جا کر کتب خانے کو دیکھ لوں۔ ان دنوں نواب صاحب کا قیام علی گڑھ میں تھا، لیکن وہ اپنے گاؤں حبیب گنج بھی جایا کرتے تھے۔ استاذ نے فرمایا کہ ہاں یہ ممکن ہے۔ جب نواب صاحب حبیب گنج جائیں، تو آپ بھی ان کے ساتھ جائیں۔ ۴۴۔۱۔۱۸ کو نواب صاحب کے نام ایک خط قلم بند کر کے مجھے دیا۔ لیکن نواب صاحب پہلے ہی حبیب گنج جا چکے تھے۔ اس کے بعد اس سمت میں مزید پیش رفت نہ ہو سکی۔

لیکن نواب صاحب کے ہم نام ایک اور حبیب الرحمٰن تھے، جن سے علی گڑھ میں ملنے کا اتفاق ہوا۔ وہ تھے پنڈت حبیب الرحمٰن جو شاستری یونیورسٹی ہائی اسکول میں اردو کے استاد تھے۔ انہوں نے سنسکرت میں ایم اے کی ڈگری حاصل کی تھی اور اس مناسبت کسے پنڈت کے لقب سے ملقب تھے۔ ساٹھ سال کے قریب ان کی عمر ہو گی۔ وہ ایک صوفی منش بزرگ تھے۔ پہلی ملاقات میں جب ان کو معلوم ہوا کہ میں سندھ سے ہوں، تو بڑی شفقت سے پیش آئے۔ بتایا کہ ان کا خاندان حضرت عثمان سندھی کے سلسلے سے منسلک رہا ہے، جن کا مزار لکھنو کے اطراف میں کہیں ہے۔

پنڈت حبیب الرحمٰن صاحب عالم فاضل تھے۔اور ان سے میری عقیدت میں دن بدن اضافہ ہوتا گیا۔ میں نے کہا: قبلہ! مجھے افسوس ہے اور ہمیشہ لیے رہے گا کہ میں نے سنسکرت کیوں نہ پڑھی۔اس پر میری تسلی کے لیے فرمایا کہ سنسکرت ادب میں فلسفۂ رس یا انبساط، جو کہ علم بدیع ومعانی میں سے ہے مطالعے، کے قابل ہے۔اور اس پر میں نے سلیس اردو میں ایک کتاب لکھی ہے، جو آپ کو دے رہا ہوں۔آپ اس کو پڑھیں تا کہ اس پر مزید گفتگو ہو سکے۔ میں نے شکریہ ادا کیا۔ اور جب کتاب پڑھی تو محسوس کیا کہ اردو میں یہ مختصر کتاب فلسفہ انبساط (رس) پر ایک شاہکار تصنیف ہے۔

قبلہ استاذ المیمنی کی قریبی صحبتوں میں مسلسل رہنمائی سے، اور ساتھ ہی عربی و فارسی مصنفات اور مستشرقین کی لکھی ہوئی کتابوں کے مطالعے سے، ۱۹۴۵ء کے آغاز تک، مجھے اپنے آپ میں اتنی استعداد محسوس ہوئی کہ کچھ لکھوں تو لکھ سکوں گا۔ چنانچہ اموی دور کے آخر میں ایک باغی قائد منصور بن جمہور (۸) کے السند پر تسلط کے سلسلے میں کچھ لکھا، مگر محسوس ہوا کہ میری انگریزی بہت کمزور ہے۔

اس وقت شعبۂ تاریخ کے شیخ عبدالرشید صاحب نے میری مدد فرمائی اور مسودے کی تصحیح کی۔ ساتھ ہی تحقیقی مواد سے متاثر ہو کر آئندہ کے لیے بھی اعانت کا وعدہ فرمایا۔ان دنوں اسلامک کلچر (حیدر آباد دکن) میں کلکتہ یونیورسٹی کے پروفیسر جناب محمد اسحاق صاحب کا مقالہ شائع ہوا تھا، جس میں انہوں نے ''فتوح البلدان'' کے مصنف بلاذری کے اس بیان کو غلط قرار دیا تھا کہ: دیبل (سندھ) بھروچ (گجرات) اور تھانہ (نزد بمبئی) پر مسلمانوں کا پہلا بحری حملہ حضرت عمر کی خلافت میں سنہ ۱۵ ہجری میں ہوا۔انہوں نے دلائل پیش کئے کہ یہ حملہ حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کی خلافت میں سنہ ۲۴ھ میں ہوا ہے، اس کے برعکس میں اپنے مطالعے کے دوران اس نتیجے پر پہنچا تھا کہ مورخ بلاذری کمال حد تک ثقہ ہیں اور ان کے حوالوں کو رد کرنا یا ہلانا آسان نہیں۔لہٰذا میں نے فاضل پروفیسر کے دلائل کا جائزہ لینا شروع کیا اور ان کو رد کرتے ہوئے بلاذری کے حوالے کی تصدیق اور تائید میں ایک مقالہ تیار کیا۔ مجھے محسوس ہوا کہ پہلے مقالے کی

نسبت اس مقالے میں میری انگریزی کچھ بہتر تھی، تاہم اپنے استاد بھائی سید محمد یوسف سے گذارش کی جنہوں نے پورے مقالے کو پڑھ کر میری کمزور عبارتوں کی تصحیح فرمائی۔ اس کے بعد جب یہ مقالہ اسلامک کلچر کے ایڈیٹر کو بھیجا گیا، تو انہوں نے اشاعت کے لیے قبول کرلیا، جس پر مجھے بہت بہت خوشی ہوئی اور اطمینان ہوا کہ میں اپنا ڈاکٹریٹ کی ڈگری والا مقالہ خیر خوبی سے لکھ سکوں گا۔ لیکن یہ مقصد پورا نہ ہو سکا۔

سندھ کے وزیر اعلیٰ اور اولڈ علیگیرین جناب پیر الٰہی بخش صاحب کی کوشش سے کراچی میں مسلمانانِ سندھ کا پہلا اعلیٰ تعلیمی ادارہ سندھ مسلم کالج قائم ہوا، اور مسلم یونیورسٹی کے ایک استاد ڈاکٹر امیر حسن صاحب صدیقی کو اس کالج کا پرنسپل مقرر کیا گیا۔ انہوں نے مجھے ترغیب دی کہ میں کالج میں آجاؤں۔

استاذ میمنی نے فرمایا کہ اگر آپ وہاں گئے تو آپ کا مقالہ رہ جائے گا۔ میں رک گیا۔ مگر شاید ڈاکٹر امیر حسن صاحب نے پیر الٰہی بخش صاحب کو مشورہ دیا، اور انہوں نے وائس چانسلر ڈاکٹر ضیاء الدین صاحب کے نام خط بھیجا کہ اس نئے کالج کے لیے اسٹاف کی ضرورت ہے، اور مجھے کالج میں آنے کی ترغیب دی جائے۔ ڈاکٹر صاحب نے یہ خط استاذ محترم کو بھیج دیا، جس پر انہوں نے فرمایا کہ اگر ان کو آپ کی ضروت ہے تو پھر آپ جائیں۔ مجھے لیکچرر بننے پر جتنی خوشی ہوئی، اس سے کچھ زیادہ ہی استاذ محترم سے مفارقت اور مسلم یونیورسٹی سے رخصت ہونے پر رنج ہوا۔

اس سرگذشت کے شروع میں مسلم یونیورسٹی کی ان دنوں کی انتظامیہ کے بارے میں میرے ایک ذاتی تاثر کا ذکر آچکا ہے کہ انتظامیہ پس پردہ تھی اور یونیورسٹی میں اجتماعی زندگی کی دیرینہ روایت سے طلبہ میں نظم و نسق قائم تھا۔ باجود اس کے کہ انتظامیہ گویا غیر مرئی (Invisible) تھی، تاہم بے خبر نہ تھی۔ کم از کم وائس چانسلر ڈاکٹر ضیاء الدین صاحب کلی طور پر باخبر و بیدار تھے۔ وہ سینئر طلبہ میں سے اکثر کو ذاتی طور پر جانتے تھے اور بعض کو ضرورت کے وقت اپنے ہاں بلا کر کوئی نہ کوئی کام ان کے حوالے کر دیتے تھے۔ داخلے کے بعد میری ان سے دو سال

تک کوئی ملاقات نہیں ہوئی تھی۔ البتہ ایک دن غیر رسمی طور پر ڈاکٹر صاحب ایس ایس ایسٹ (پکی بارک ہوسٹل کی مشرقی ونگ) کے سامنے سے گذر رہے تھے۔ ہم چند طلبہ وہاں پر کھڑے تھے تو آ کر ہمارے سامنے رکے۔ ہم نے سلام کیا اور انہوں نے خیریت پوچھی۔ وہ دن سخت سردی کے دن تھے۔ ڈاکٹر صاحب ایک موٹی شیروانی پہنے ہوئے تھے۔ جس میں اندر سے روئی بھری ہوئی تھی۔ انہوں نے خاص طور پر مخاطب ہو کر فرمایا کہ آپ بھی میری شیروانی جیسی شیروانیاں بنوالیں۔ اس کے اندر روئی بھری ہوئی ہے اور اس سے سردی نہیں لگتی۔ پھر یہ سستی بھی ہے اور بنوانے میں زیادہ کچھ خرچ نہیں ہوتا۔

باوجود اس کے ڈاکٹر صاحب سے میری کبھی کوئی ملاقات نہیں ہوئی تھی، وہ غائبانہ طور پر میرے متعلق کچھ نہ کچھ جانتے تھے کہ ۱۹۴۳ء۔ ۱۹۴۴ء کے دوران انہوں نے دوبار مجھے بلایا۔ پہلی بار ان کا پیغام ملا تو حیرانی ہوئی کہ وائس چانسلر صاحب مجھے کیوں بلا رہے ہیں۔ جا کر ملا تو فرمایا کہ ریاست جونا گڑھ کے دیوان (وزیراعظم) شیخ عبدالقادر صاحب جو اصل سندھ کے ہیں، پرسوں یہاں پر آ رہے ہیں۔ وہ ریاست کی طرف سے یونیورسٹی کے طبیہ کالج کے لیے ایک لاکھ روپے کا عطیہ دیں گے۔ ضروری ہے کہ ان کو چائے پر بلایا جائے اور خوش آمدید کہا جائے تو بہتر ہوگا کہ ان کو یہ چائے یونیورسٹی میں سندھ کے طالب علموں کی طرف سے دی جائے۔ دعوت نامہ چھپوالیا گیا ہے اور چائے کا انتظام کرکٹ گراؤنڈ پر ہوگا۔ آپ سندھ کے طلبہ کی تنظیم کے صدر کی خدمات انجام دیں۔ سب طلبہ کو بلائیں۔ آپ میرے ساتھ رہیں گے اور شیخ صاحب کو خوش آمدید کہیں گے۔ اس کے بعد آپ ان کو خطبۂ استقبالیہ پیش کریں گے اور پھر ہر طالب العلم کا تعارف کروائیں گے۔ چنانچہ میں نے یہ خدمت سرانجام دی، اور ہمارے معزز مہمان شیخ صاحب بہت متاثر ہوئے۔

دوسری بار ڈاکٹر صاحب کا پیغام آیا کہ میں شام کو ان سے ان کے گھر پر ملوں۔ جب وہاں پہنچا تو مجھے ڈرائنگ روم میں بٹھایا گیا، اور جب ڈاکٹر صاحب تشریف لائے تو چائے بھی آ گئی۔ اپنے ساتھ بٹھا کر چائے پلائی اور پھر فرمایا کہ آپ مسلم یونیورسٹی میں خاکساروں کے

سالارِ اعلیٰ ہیں اور یونیورسٹی کے ایک ذمہ دار طالب علم بھی۔ لہٰذا آپ یونیورسٹی کے حق میں اس موقع پر ہماری مدد کریں۔ وہ یہ کہ میں نے سنا ہے کہ علامہ مشرقی صاحب شہر میں تشریف لائے ہیں اور وہ یونیورسٹی میں طلبہ کو خطاب کرنے کا ارادہ رکھتے ہیں۔ یہ جنگ کا زمانہ ہے (اس وقت دوسری عالمی جنگ چل رہی تھی) ہندوستان کے کمانڈر چیف یونیورسٹی میں آنے والے ہیں اور ہمارے طلبہ میں سے کئی نوجوانوں کو فوج میں اچھے عہدے مل جائیں گے۔ آپ ابھی سے جا کر علامہ صاحب سے ملیں۔ ان کو میری طرف سے گذارش کریں اور خود بھی ان کو منوائیں کہ یونیورسٹی میں آنے اور خطاب کرنے کا پروگرام فی الحال ملتوی کر دیں۔

مجھے معلوم تھا کہ ایسا کوئی پروگرام نہیں۔ بہرحال میں نے اپنی طرف سے ڈاکٹر صاحب کو یہ کہہ کر مطمئن کیا کہ علامہ صاحب یقینی طور پر ان حالات کو مدنظر رکھیں گے اور میں ابھی جا کر ان سے ملتا ہوں۔ چنانچہ میں جا کر ملا، لیکن علامہ صاحب نے پہلے ہی یونیورسٹی میں آمد کا پروگرام ملتوی کر دیا تھا۔ پھر بھی میں نے ان کو ڈاکٹر صاحب کا پیغام پہنچایا اور جو کچھ انہوں نے کہا تھا کہ وہ سب سنایا۔ علامہ صاحب نے کہا آپ جا کر وائس چانسلر صاحب کو کہیں کہ میں کل علی گڑھ سے روانہ ہونے والا ہوں اور یونیورسٹی میں آنے کا کوئی ارادہ نہیں میں، میں شہر سے سیدھا ڈاکٹر صاحب کے گھر پہنچا اور بتایا کہ علامہ صاحب یونیورسٹی میں نہیں آ رہے ہیں۔ یہ سن کر ڈاکٹر صاحب خوش ہوئے۔

تیسری بار ڈاکٹر صاحب نے مجھے تب یاد کیا جب میں مسلم یونیورسٹی چھوڑ چکا تھا اور گورنمنٹ آف (برٹش) انڈیا کی سکالرشپ حاصل کر کے امریکہ میں کولمبیا یونیورسٹی نیویارک میں (۱۹۴۶ء۔۱۹۴۷ء) میں پڑھ رہا تھا۔ علی گڑھ سے خط پہنچا کہ مجھے اور مدثر حسین شمسی کو منتخب کیا گیا ہے کہ ہم فلاڈلفیا شہر میں امریکن اکاڈی آف سوشل اینڈ پولیٹکل سائنس کے خاص اجتماع میں مسلم یونیورسٹی کی نمائندگی کریں۔ چنانچہ ہم نے نمائندگی کی۔

اس سے معلوم ہوا کہ بعض طلبہ جب یونیورسٹی سے چلے جاتے تھے تو بھی ان کو محل وموقع سے یاد کیا جاتا تھا۔ ڈاکٹر صاحب مرحوم تو راقم کو اس وقت بھی نہیں بھولے، جب نہ میں

یونیورسٹی کا طالب تھا اور نہ وہ وائس چانسلر تھے۔ سال ۱۹۴۸ء۔۱۹۴۹ء میں جب میں ابتدائی مراحل طے کر کے ڈاکٹریٹ کی ڈگری کے لیے مقالہ تیار کر رہا تھا، تو جاپان سے ڈاکٹر ضیاء الدین صاحب کا خط پہنچا کہ میں فلاں تاریخ کو نیویارک پہنچ رہا ہوں اور فلاں ہوٹل میں ٹھہروں گا۔ آپ پہلے ہی دن صبح کو ۱۱ بجے میرے ہاں آئیں۔ مقررہ وقت پر جا کر میں ان سے ملا۔ بہت خوش ہوئے۔ تین چار روز تک یا کچھ زیادہ ٹھہرے، میں روزانہ ان کی خدمت میں حاضر ہوتا رہا، آخری دن ہوائی اڈے تک ان کے ساتھ رہا۔ فرمایا کہ میں اب یہاں سے لندن جا رہا ہوں۔ چنانچہ لندن پہنچنے کے بعد انہوں نے مجھے شکریے کا ایک مختصر مگر محبت آمیز خط لکھا۔ اس کے بعد کوئی دو چار ہفتے گذرے تھے کہ خبر آئی کہ ڈاکٹر ضیاء الدین لندن میں فوت ہو گئے۔ رحمہ اللہ

میں ۱۹۴۹ء میں امریکہ سے واپس آیا۔ تقریباً گیارہ برس کے بعد ۱۹۶۰ء میں انڈیا پاکستان کلچرل کانفرنس میں ڈیلی گیٹ کی حیثیت سے دلی پہنچا اور وہاں سے ایک دن کے لیے مسلم یونیورسٹی کو دیکھنے کا موقع ملا۔ میں اپنے ایک پرانے ساتھی ڈاکٹر سید مقبول احمد کے یہاں یونیورسٹی سے باہر کہیں ٹھہرا اور وہاں سے صبح کو جب یونیورسٹی کی طرف آیا تو ایک انوکھا منظر دیکھا، وہ یہ کہ نقوی پارک جس کی داغ بیل ہمارے طالب علمی کے زمانے میں ڈالی گئی تھی، وہ اب بڑے بڑے درختوں کا باغ بن گیا تھا۔ شعبۂ تاریخ میں تحقیق کے نئے منصوبے جنم لے رہے تھے۔ شمال مشرق کی طرف مولانا آزاد لائبریری کی شاندار عمارت کچھ عرصہ پہلے بن چکی تھی اور لائبریری کو اسٹریچی ہال کے نزدیک والی عمارت سے وہاں منتقل کر دیا گیا تھا۔

پروفیسر حبیب صاحب ریٹائرڈ ہو چکے تھے۔ ان کو میں نے پہلے ہی اپنی آمد کا خط لکھا تھا اور انہوں نے چائے پر بلایا تھا۔ جب میں ان کی کوٹھی پر پہنچا، تو اس وقت وہ اوپر والی منزل پر تھے۔ ایک لمحے میں جوانی والی رفتار سے کسی کے سیڑھی سے نیچے اترنے کی آواز آئی۔ میں نے سمجھا کہ ڈاکٹر عرفان حبیب ان کے جوان صاحبزادے ہوں گے۔ اتنے میں حبیب صاحب سامنے آ گئے۔ بہت ہی شفقت سے ملے۔ خیریت پوچھی۔ چائے پلائی، گاڑی نکلوائی اور مشفقانہ اصرار سے مجھے اسٹیشن لے چلے اور جب گاڑی چل پڑی، تب ہاتھ ہلا کر مجھے خیرباد کہتے ہوئے باہر کی

طرف مڑے۔حبیب صاحب میں باوجود ریٹائرڈ ہونے کے جوانی کی لہریں موجزن تھیں۔بہرحال ایک دن کے اس تاثر اور تجزیے سے مجھے مسلم یونیورسٹی میں جا بجا پھلنے پھولنے کے آثار نظر آئے، جیسا کہ آتے ہی نقوی پارک کے تن آور درختوں سے محسوس ہو رہا تھا۔

تعلیقات وحواشی

(۱) سورۃ البقرۃ:۲۱۶، ترجمہ: عجب نہیں کہ ایک چیز تم کو بری لگے اور تمہارے حق میں بھلی ہو۔

(۲) جناح صاحب پر یہ حملہ غالباً ۲۶ جولائی ۱۹۴۳ء کو ہوا۔

(۳) رؤبۃ بن العجاج (ت:۱۴۵ھ)، رجزیہ شاعری میں شہرت پائی۔لغت کے امام تھے، جب وہ فوت ہوئے، علم عروض کے بانی خلیل بن احمد نے فرمایا: ہم نے آج شعر، لغت اور فصاحت کو دفنا دیا۔

(۴) مہلب بن ابی صفرۃ (ت:۸۳ھ) مسلمان حکومت کے باغی ازارقہ کے خلاف ان کو جنگ کا کمانڈر بنایا گیا، جن سے مسلسل ۱۹ سال تک لڑتا رہا۔بالآخر کامیاب ہوا۔

(۵) زیاد بن اُبیہ (ت:۵۳ھ) حضرت ابوبکر کے دور میں مسلمان ہوئے، بڑے ذہین جرنیل تھے۔دراہم ودنانیر پر ''اللہ'' کا نام سب سے پہلے انہوں نے شروع کیا۔

(۶) میسون بنت بہدل (ت:۸۰ھ) بڑی شاعرہ گذری ہے۔

(۷) (ترجمہ) وہ گھر جس میں ہوائیں چلتی رہیں، اس بلند وبالا محلات سے میرے لیے بہتر ہے۔

(۸) منصور بن جمہور (ت:۱۳۳ھ) اموی دور کے مشہور قائد، جس نے سندھ پر تسلط قائم کیا۔جب عباسیوں کی حکومت قائم ہوئی تو عباسیہ کے پہلے حکمران ابوالعباس سفاح نے اس کے طرف موسیٰ بن کعب کو بھیجا، جس نے اسے شکست دی۔

(۳)

ایام امریکہ

(۱۹۴۶ء۔۱۹۴۹ء)

یہ سال ۱۹۴۶ء کے نصف آخر کا ذکر ہے، جب میں کولمبیا یونیورسٹی نیویارک میں طالب علم تھا۔عید الاضحیٰ کا موقع تھا اور ہم نے سنا کہ ہندوستان سے ایک عالم دین آئے ہیں، جو شہر نیویارک میں مسلمانوں کو نماز عید پڑھائیں گے۔''انڈین سیمین کلب'' کی مسلم جماعت کی طرف سے ان کو مدعو کیا گیا تھا۔یہ جماعت بنگال کے باشندہ مسلمانوں کی تھی۔

عید کے دن جب اس جگہ پہنچے جہاں نماز کا انتظام تھا،تو معلوم ہوا کہ وہ عالم دین آزاد سبحانی ہیں۔غالباً کلکتے میں عید کے موقع پر مولانا آزاد سبحانی کی امامت کی شہرت سے متاثر ہوکر، ان کو نیویارک میں امامت کے لیے مدعو کیا گیا تھا۔مولانا صاحب نماز عید کا خطبہ عربی میں دینے والے تھے اور ضرورت اس بات کی تھی کہ اس خطبے کا انگریزی ترجمہ بھی ساتھ ہی سنایا جائے۔ چونکہ میں عربی سے کچھ مانوس تھا، لہٰذا یہ خدمت میرے سپرد کی گئی۔مولانا نے بڑا موٴثر اور شاندار خطبہ دیا، البتہ کہہ نہیں سکتا کہ میں نے ترجمے کا حق کہاں تک ادا کیا؟ بہر حال یہ ایک سبب بنا کہ مولانا سے میری قریبی ملاقات ہوگئی۔ میں ان کی درویشانہ، مدبرانہ اور جاذب نظر شخصیت کا گرویدہ ہوگیا۔

نماز عید کے بعد ہم اپنے ہوسٹل واپس آئے اور دوسرے دن تعلیمی پروگرام میں مشغول ہوگئے۔شاید دو روز گزر گئے کہ میرے دل میں خیال آیا کہ مولانا صاحب کا پتہ کرنا چاہیے کہ اب وہ کہاں ہیں اور کیا کر رہے ہیں؟ اس ارادے سے، کچھ وقت بچا کر میں ''انڈین سیمین کلب'' پہنچا،

تو دیکھتا ہوں کہ وہاں اور تو کوئی بھی نہیں، البتہ مولانا صاحب دروازے کے ساتھ ایک بینچ پر تن تنہا بیٹھے ہیں۔ میں نے مصافحہ کیا اور حال پوچھا۔ کہنے لگے: سب خیر ہے، ہاں اس وقت آپ اگر مجھے تمبا کو دلوادیں تو آپ کی مہربانی ہوگی۔ مولانا صاحب ان دنوں پائپ پیتے تھے۔ پائپ ان کے ہاتھ میں تھا اور منہ کو لگا رہے تھے، لیکن سلگا ہوا نہیں تھا۔ میں تمبا کو کی ڈبیا خرید کر کے لایا اور مولانا صاحب پائپ سلگا کر بہت خوش ہوئے۔

بعد میں باتوں میں پتہ چلا کہ کل صبح سے لے کر انہوں نے کچھ کھایا بھی نہیں اور نہ وہاں کوئی انہیں کھلانے والا تھا۔ میں نے حسب حال کچھ کھانے کا بندوبست کیا اور پھر ان سے یوں گذارش کی کہ

''مولانا صاحب! آپ یہاں اکیلے ہیں، اگر اجازت ہو تو میں آپ کے لیے کہیں رہائش کا انتظام کردوں، جو کہ یہاں کے غریب مسلمانوں کے یہاں ہوگا۔''

یہ سن کر انہوں نے فوراً مان لیا۔ میں نے اسی شام کو ''اکیڈمی آف اسلام'' کے ایک رکن مختار احمد صاحب کے یہاں ان کی رہائش کا بندوبست کرادیا۔

یہ اکیڈمی ''ہارلم'' میں تھی۔ ''ہارلم'' حبشی نسل کے لوگوں کا مسکن ہے۔ اس اکیڈمی کی بنیاد کچھ سال پہلے عطیہ بیگم مرحومہ نے ڈالی تھی۔ یہ ان دنوں کی بات ہے جب عموماً کوئی باہر سے آنے والا مسلمان ''ہارلم'' کا نام تک نہیں لیتا تھا۔ لیکن عطیہ بیگم مرحومہ نے وہیں پر ایک اسلامی ادارے کی بناڈالی تھی۔ میں اور ایک دو طلبہ رفیق، اتوار کے روز ''اکیڈمی آف اسلام'' میں جاتے تھے۔ نومسلموں سے ملتے تھے اور ان کے ساتھ نماز پڑھتے تھے۔ وہاں کے ایک سرگرم رکن محترم مختار احمد تھے، جن کا اپنا گھر تھا۔ میں نے جب ان سے مولانا کی رہائش کے مسئلے کا ذکر کیا، تو محترم مختار احمد نے بخوشی قبول کرلیا، کہ مولانا موصوف ان کے ہاں بطور مہمان ٹھہریں۔ چنانچہ میں مولانا صاحب کو ان کے گھر لے آیا اور مختار صاحب اور ان کی اہلیہ نے مولانا کے لیے ایک خاص کمرہ مخصوص کردیا اور ان کی خاطر خواہ خدمت کرتے رہے۔ اس کے بعد مولانا صاحب سے ملاقاتیں ہوتی رہیں اور میں ان کے تبحر علمی سے استفادہ کرتا رہا۔

مولانا موصوف کافی عرصے (غالباً تین چار مہینے) تک وہاں مقیم رہے۔ اس مدت میں وہ ہر اتوار اور کبھی دوسرے اتوار کو شہر نیویارک کی مسلم تنظیموں کو اپنے خطبات سے نوازتے تھے۔ مولانا کا خطاب عربی میں ہوتا تھا اور میں ان کے انگریزی مترجم کے فرائض انجام دیتا تھا۔ ایک روز فرمایا کہ

''آج میں انگریزی میں تقریر کروں گا اور جہاں میرے الفاظ میں کمی محسوس ہو، وہاں مناسب الفاظ ڈال دیجیئے گا اور جس جگہ میرے الفاظ مبہم لگیں، وہاں ان کا آسان نعم البدل بیان کر دیجیئے گا۔''

انگریزی میں ان کا پہلا خطاب تھا تو انتہائی دلچسپ، مگر حاضرین ان کے مافی الضمیر کو سمجھ گئے۔ یونہی چار پانچ تقریریں کرنے کے بعد ان کے انگریزی انداز بیان میں کافی صحت اور معنویت پیدا ہوگئی۔ اور ہم محو حیرت ہو کر ان کی ذہانت پر داد دینے لگے۔

بعد ازاں ایک بار مجھے فرمایا کہ میں فلسفہ ربانیت کی روشنی میں اسلام کے متعلق انگریزی میں ایک کتابچہ لکھنا چاہتا ہوں، جسے اگر آپ شائع کروا دیں گے، تو یہاں پر رہنے والوں کے لیے کافی مفید ثابت ہوگا۔ چنانچہ انہوں نے ایک دو روز میں مسودہ تیار کر لیا اور تصحیح کے لیے مجھے دے دیا۔ میں نے اس کی مناسب اصلاح کر دی اور ایک تعارفی نوٹ کا اضافہ کر کے اسے شائع کروا دیا۔ ان دونوں میں ''عبداللہ عثمان السندی'' کے قلمی نام سے لکھا کرتا تھا اور تعارف کے آخر میں بھی یہی نام لکھا ہوا ہے۔

اس وقت یونیورسٹی میں ہمارے ایک پروفیسر صاحب نفسیات کے گیسٹالٹ (Gestalt) نظریے کی توضیح و تفسیر کر رہے تھے اور فہم و ادراک (Learning) کے سلسلے میں فرما رہے تھے کہ ادراک بتدریج نہیں ہوتا، بلکہ بہ یک وقت فوری طور پر ہوتا ہے۔ ہم نے مولانا صاحب کو ہوسٹل میں بلایا تھا۔ جہاں پر طلبہ ان سے علمی سلسلے کے سوالات پوچھ رہے تھے۔

چنانچہ میں نے ان سے دریافت کیا کہ آیا ادراک مجمل ہے یا مفصل؟ اس پر انہوں نے بڑی دقیق گفتگو فرمائی، جو میری کتاب ''مولانا آزاد سبحانی'' کے صفحات (۷۲۔۷۳) پر درج

ہے۔

مولانا صاحب سے صحبتوں کا سلسلہ جاری رہا اور میں متواتر طور پر ان کے ہاں آتا جاتا رہا۔ اچانک ایک روز فرمایا کہ اب میں یہاں سے رخصت ہونے والا ہوں۔ میں نے پوچھا کہاں جانے کا ارادہ ہے؟

فرمایا ''مصر''۔ میں نے دریافت کیا کہ وہاں کون ہے؟ کس کے پاس جا کے ٹھہریں گے؟ تو فرمایا:

''کئی اللہ کے بندے ہوں گے۔ کسی کے پاس چلا جاؤں گا اور کوئی نہ کوئی تو مجھے ٹھہرا ہی لے گا ساتھ ہی فرمایا کہ مصر سے ہوتے ہوئے ہندوستان چلا جاؤں گا، اور وہاں جا کر جواہر لعل نہرو سے ملوں گا۔ یہاں جو کچھ دیکھا اور سمجھا ہے یہ ان کے گوش گذار کروں گا اور سب سے بڑھ کر یہ کہ ان سے ہندوستان کے مسلمانوں کے بارے میں گفتگو کروں گا، تا کہ حصول آزادی کے بعد مسلمان وہاں پر عزت کی زندگی بسر کر سکیں۔

میں نے پوچھا اس کے بعد آپ کے کیا پروگرام ہوں گے؟

فرمایا:

''ہندوستان کے بعد روس جاؤں گا اور وہاں اپنے فلسفۂ ربانیت کی روشنی میں ان کو سوشلزم کے صحیح مفہوم کی طرف راہنمائی کروں گا''

میرے خیال میں، مولانا سوشلزم کے بعض پہلوؤں کو اچھا تصور کرتے تھے، خاص طور پر یہ کہ سوشلزم میں کام کرنے والوں اور مزدوروں کو ایک مقام حاصل ہوا ہے۔ ان کے خیال میں یہ جذبۂ اسلامی فکر کی روح میں سے ہے۔ فرماتے تھے کہ ازروئے قرآن خود اللہ تعالیٰ کی ایک ذی شان صفت ''ورکر'' کی سی ہے کہ ''کل یوم ھو فی شان'' (الرحمٰن ۲۹)

چنانچہ اپنے اسی فکر کے پیش نظر انہوں نے اپنے انگریزی کتابچے میں بھی ایک باب اس عنوان سے باندھا ہے کہ ''اللہ بحیثیت ایک ورکر کے''

جب مولانا کے ''ہارلم'' سے رخصت ہونے کی خبر وہاں کے مسلمانوں کو ملی، تو وہ ان

سے ملنے آئے اور پوچھا کہ کیا آپ کے پاس ٹکٹ آ گیا ہے؟

فرمایا:

''ٹکٹ نہ پہلے تھا اور نہ اب ہے، اللہ تبارک وتعالیٰ کوئی صورت پیدا کر دے گا۔''

اس پر اکاڈمی آف اسلام کے ممبروں نے مل کر رقم جمع کی اور مولانا کے لیے بحری جہاز کا ٹکٹ خرید لیا۔ ساتھ ہی ان کے لیے دو چار کپڑوں کے جوڑے، جن میں ٹاپ کوٹ اور پینٹ شامل تھے۔ خرید لیے۔ ایک ٹرنک اور ایک بیگ اور ان میں مولانا کے کپڑے اور مناسب سامان سفر بھر دیا گیا۔

مقررتاریخ پر ہم بندرگاہ پر مولانا کو الوداع کہنے گئے۔ ان کے لیے جمع کیا جانے والا زادِ راہ بھی ہمارے ساتھ تھا۔ سامان دیکھ کر انہوں نے مجھے اپنے قریب بلایا اور فرمایا:

''میں نے نہ کبھی پہلے سامان اٹھایا ہے اور نہ اب اٹھاؤں گا۔ اس روز میں نے اپنے بھائیوں کی دل شکنی کرنی مناسب نہ سمجھی تھی۔ اب میرے لیے جمع کیا جانے والا سامان یہیں پر رہنے دو، تاکہ کسی ضرورت مند کے کام آ سکے'' ۔۔۔۔ اور ہم سے مصافحہ کر کے اور جہاز میں چلے گئے۔

(۴)

ایامِ کراچی

(۱۹۴۹ء۔۱۹۵۱ء)

سنہ ۱۹۴۶ء میں اعلیٰ تعلیم کے لیے میں امریکہ (کولمبیا یونیورسٹی) چلا گیا۔ وہاں سے سنہ ۱۹۴۹ء میں واپس کراچی پہنچا، جو اب پاکستان کا پایۂ تخت تھا۔ میں ڈاکٹر تو بن کر آیا تھا، لیکن ملازمت کے لیے دروازے بند تھے۔ ایک سال سے زیادہ عرصے تک پریشان حال رہا تا آنکہ مئی ۱۹۵۰ء میں مرحوم شیخ محمد اکرام نے (جو اس وقت منسڑی آف انٹیریر کی انفارمیشن اور براڈ کاسٹنگ ڈویژن میں جوائنٹ سیکریٹری تھے) کہیں مجھے دیکھ کر درخواست دینے کو کہا اور اپنی ڈویژن میں ''افسر بکار خاص'' (O,S,D) کے طور پر منتخب فرمایا اور میں قدرت اللہ شہاب مرحوم (جو اس وقت ڈپٹی سیکریٹری تھے) کے ماتحت کام کرنے لگا۔ اکرام صاحب نے غالباً میرے مضامین دیکھے تھے۔ جو رسالہ ''اسلامک کلچر'' (حیدرآباد دکن) میں چھپے تھے۔ ایک دن مجھے اپنے آفس بلا کر کہا کہ ''انجمن ترقی اردو'' میں مولانا عبدالحق صاحب کے ذاتی کتب خانے میں ''شرف نامۂ احمد منیری'' نام کی فارسی کتاب کا ایک قلمی نسخہ ہے، جو میں چاہتا ہوں کہ آپ دیکھیں اور اس پر ایک مضمون لکھیں۔ آج شام آپ میرے ساتھ چلیں، تاکہ مولانا صاحب سے مل کر یہ کتاب حاصل کی جائے۔ چنانچہ اکرام صاحب کے ساتھ میں انجمن ترقی اردو میں مولانا صاحب کی خدمت میں حاضر ہوا اور اکرام صاحب نے اچھے الفاظ میں میرا تعارف کرایا۔ مولانا نے مجھ سے پوچھا کہ: آپ نے کہاں تعلیم پائی ہے اور یہ کہ فارسی سے کتنا مانوس ہیں کہ اس قلمی کتاب کو پڑھ سکیں۔ میرے جواب سے پہلے اکرام صاحب نے انہیں مطمئن کرلیا۔ البتہ میں نے

ان کو بتایا کہ قیام پاکستان سے پہلے میں یہاں پر کراچی میں انجمن ترقی اردو کی برانچ کی لائبریری کا ممبر تھا، جو پاکستان چوک کے قریب واقع تھی۔ سن کر مزید مطمئن ہوئے۔ اتنے میں قاضی احمد میاں اختر صاحب آگئے۔ میں نے دیکھتے ہی پہچان لیا اور اٹھ کر مصافحہ کیا۔ بعد میں نیچے آکر (اتنا یاد پڑتا ہے کہ ہم مولانا سے ملنے یا کتاب نکلوانے کے سلسلے میں سیڑھی چڑھ کر اوپر گئے تھے) قاضی صاحب سے اپنا تعارف کروایا اور جوناگڑھ کی یادیں تازہ کیں۔ بہت بہت خوش ہوئے اور کہا کہ میں چاہوں گا کہ آپ کے علمی مشاغل سے باخبر رہوں۔ خاص موقعوں پر آپ مجھے یاد کیا کریں اور میرے پاس آیا کریں۔ مجھے اپنے مکان کا پتہ بتا دیا، جو گاڑی کھاتے کے سامنے بندر روڈ پر ٹھٹائی کماؤنڈ بلڈنگ کی چوتھی منزل پر ایک ''فلیٹ'' تھا۔

شرف نامے کا یہ قلمی نسخہ کرم خوردہ اور بوسیدہ تھا۔ بعض عبارتوں کو پڑھنا اتنا آسان نہ تھا۔ شیخ اکرام صاحب کی ترجیحات کا مجھے کچھ اندازہ تھا۔ لہٰذا میں نے چاہا کہ کتاب کے تاریخی اور ثقافتی پہلوؤں پر روشنی ڈالنے کی کوشش کروں۔ ابتدائی مطالعے سے ہی معلوم ہو گیا کہ مصنف ابراہیم قوام فاروقی نے، اپنی کتاب کا انتساب بہار کے بزرگ شیخ شرف الدین احمد بن یحیٰ منیری کے نام نامی سے کیا۔ لیکن انہوں نے یہ کتاب بنگالہ میں لکھی۔ لہٰذا میں نے مناسب سمجھا کہ اس زمانے میں بنگالہ کے تاریخی و علمی پس منظر پر روشنی ڈالی جائے۔ اس سلسلے میں کچھ حالات جمع کیے اور پھر قاضی صاحب سے مشورہ کیا۔ میری کوشش کو دیکھ کر خوش ہوئے اور پھر اپنی معلومات سے نوازا، جس کا ذکر خیر میں نے اپنے مضمون کے حواشی میں کر دیا۔ قاضی صاحب نے کہا کہ مضمون مکمل ہو جائے تو شیخ محمد اکرام اور مولانا عبدالحق کے علاوہ ایک کاپی مجھے بھی دیجئے گا، تاکہ انجمن کے رسالہ اردو میں شائع کیا جائے۔ چنانچہ میں نے ایک کاپی جناب قاضی صاحب کے حوالے کر دی اور انہوں نے اسے رسالہ اردو بابت ماہ اکتوبر ۱۹۵۲ء اور بابت جنوری اپریل ۱۹۵۳ء میں دو قسطوں میں شائع کروا دیا۔ عنوان ہے ''مسلم بنگال کے فارسی ادب کی ایک اہم تصنیف کتاب شرف نامۂ احمد منیری''

مئی ۱۹۵۰ء تا اگست ۱۹۵۱ء میں انفارمیشن اور براڈ کاسٹنگ ڈویژن میں بطور او۔ ایس

۔ڈی کام کرتا رہا۔ اور میرا قیام کراچی میں ہی رہا، اس مدت میں جناب قاضی صاحب سے ان کے گھر پر ملاقاتیں ہوتی رہیں۔ ان کا کتب خانہ بڑا تو نہیں تھا، لیکن اس میں تحقیق و تجسس کے لیے کافی کچھ کام کی کتابیں موجود تھیں۔ میں اس وقت ''دیبل'' کے محل وقوع پر کام کر رہا تھا اور مجھے ایلیٹ اور ڈاؤسن (Elliot and Dowson) کی مرتب کردہ تاریخی جلدوں میں سے پہلی جلد کی ضرورت تھی۔ قاضی صاحب سے ذکر کیا تو فرمایا: میری کتابوں میں موجود ہے۔ پھر کتاب لے آئے اور میرے حوالے کر دی۔ ان دنوں ملازمت کی ذمے داریوں کے علاوہ میرے پسندیدہ مشغلے یہ تھے:

۱۔ کراچی میں ان نو وارد فضلاء کو جو تاریخ سے دلچسپی رکھتے تھے۔، سندھ کی تاریخ اور تاریخی آثار سے روشناس کروانا۔

۲۔ حضرت شاہ عبداللطیف اور سندھی موسیقی کے تعارف کے سلسلے میں محفلیں منعقد کرنا۔

۳۔ مرحومہ عطیہ بیگم کی ادبی ثقافتی محفلوں کا کاروبار سنبھالنا اور

۴۔ ''پین'' (PEN) تنظیم (جس کے صدر جناب شاہد سہروردی تھے) کے زیر سایہ محفلوں کا انتظام سنبھالنا (جیسا کہ مرحوم شہاب صاحب چاہتے تھے)

ان سلسلوں کے خاص خاص موقعوں پر قاضی صاحب کو بلا ناغہ اطلاع دے کر، ان کی فاقت کی سعادت حاصل کرتا رہا۔ قاضی صاحب کو موسیقی سے خاص شغف تھا۔ اور موسیقی کی محفلوں میں بہت محظوظ ہوتے تھے۔

عرب، اسلامی دور کی تاریخ کے سلسلے میں، میں نے ''دیبل'' کے محل وقوع پر مقالہ لکھا اور محکمہ آثار قدیمہ کے زیر انتظام ایک محفل میں اس کو پیش کیا۔ مرحوم ممتاز حسن (اس وقت فیڈرل مالی سیکریٹری) نے اور جناب قاضی صاحب نے بہت پسند فرمایا۔ اس مقالے میں، میں نے دیبل کو بھنبھور کے کھنڈرات سے مشخص کیا تھا۔ قاضی صاحب نے تقاضا کیا کہ: میں رہنمائی کروں تاکہ بھنبھور کے کھنڈارات دیکھے جائیں۔ اس مہم میں اور احباب بھی شریک ہوئے اور قاضی

صاحب نے مولانا ہاشمی فرید آبادی کو جو اس وقت انجمن میں کام کرتے تھے، شمولیت کی دعوت دی۔ اس طرح بعد میں ہم ٹھٹہ دیکھنے گئے۔

۱۹۵۱ء کے وسط میں پاکستان پبلک سروس کمیشن نے مجھے ''پریس اتاشی'' کے عہدے کے لیے منتخب کیا اور اگست میں دمشق میں میری تقرری کا فیصلہ ہوا۔ اب میں نے جا کر قاضی صاحب کو بتایا۔ خوش تو ہوئے، لیکن ساتھ ہی فرمایا کہ: آپ کا باہر چلا جانا ہم پر گراں گزرے گا۔ ان کے یہ الفاظ میرے دل میں بس گئے۔ مجھے تیاری کا الاؤنس مل گیا اور دمشق جانے کی تیاری کررہا تھا کہ قبلہ علامہ آئی آئی قاضی، وائس چانسلر سندھ یونیورسٹی حیدرآباد سے کراچی تشریف لائے اور پیغام بھیجا کہ میں ان سے ملوں۔ جا کر ملا تو پوچھا کہ: آج کل کیا کررہے ہیں؟ میں نے بتایا کہ: فیڈرل پبلک سروس کمیشن سے میرا انتخاب ہوا ہے اور دمشق جانے کی تیاری کررہا ہوں، کہ وہاں پر میری تقرری ہوئی ہے۔ سن کر انہوں نے زوردار ترغیب دی کہ میں رک جاؤں۔ اور سندھ یونیورسٹی میں ''پروفیسر آف ایجوکیشن'' کا عہدہ سنبھال لوں۔ قبلہ علامہ قاضی صاحب سے کالج کے دنوں سے عقیدت تھی۔ میں نے عرض کیا کہ: قبلہ! میں خدمت تعلیم کو گورنمنٹ سروس پر ترجیح دیتا ہوں، مگر سندھ یونیورسٹی تو ایک ممتحن یونیورسٹی ہے اور ہوسکتا ہے کہ وہاں سے کبھی بھی مجھے رخصت کردیا جائے۔ فرمایا کہ: میں سندھ یونیورسٹی کو ایک مثالی تربیت گاہ بنانا چاہتا ہوں۔ اب یہ ''ریزیڈنشل ٹیچنگ یونیورسٹی'' ہوگی اور یہ بسم اللہ آپ ہی کی تقرری سے ہوگی۔ مزید یہ کہ آپ کی تقرری کے آرڈر میں لکھ دیا جائے گا کہ رٹائرمنٹ تک آپ کو سیکورٹی آف ٹینیوئر دی گئی ہے۔

یہ تو ان کی شفقت تھی، البتہ میرے لیے صبر آزما صورت حال سامنے تھی۔ کہ دمشق جانے کو خیر باد کہوں۔ دو روز گزرے ہی تھے کہ قبلہ علامہ صاحب نے یکم ستمبر ۱۹۵۱ء سے سندھ یونیورسٹی میں میری تقرری بطور پروفیسر آف ایجوکیشن کا آرڈر بھجوادیا، جس میں ''ٹینیوئر'' کا بھی اندراج تھا۔ یہ تیس اگست کا دن تھا۔ قبلہ علامہ صاحب کی ترغیب کے مدنظر مجھے اتنی توفیق ہوئی کہ دوسرے دن یعنی ۳۱۔ اگست کو میں شہاب صاحب سے ملا اور ان کو اپنے استعفے کے فیصلے سے آگاہ

کیا۔ دونوں نے سمجھایا کہ: اتنی اچھی ملازمت نہ چھوڑوں، لیکن میں نے ان کو منوایا کہ میرا استعفاء قبول کرلیا جائے۔ دونوں کرم فرما پھر مجھے سیکریٹری مسٹر جی۔ احمد کے پاس لے گئے، جنہوں نے بعض مراعات کے حوالے سے مجھے ترغیب دی کہ میں ملازمت نہ چھوڑوں۔ میں نے شکریہ ادا کیا اور گذارش کی کہ میں تعلیم کی خدمت کی خاطر یونیورسٹی کی ملازمت کو ترجیح دے رہا ہوں، للہذا میرا استعفاء قبول کرلیا جائے۔ اس پر جی احمد صاحب نے پوچھا کہ آپ کب جانا چاہتے ہیں؟ میں نے کہا آج ہی۔ اس پر انہوں نے فائل پر دستخط کر دیے۔ اسی دن میں قاضی صاحب کے ہاں پہنچا اور کہا کہ قبلہ میں ایک خوشخبری لایا ہوں۔ اور وہ یہ کہ میں دمشق نہیں جاؤں گا۔ حیران رہ گئے کیوں کہ دو چار روز پہلے ہی میں ان کو بتا چکا تھا کہ ملک سے باہر جانے والا ہوں۔ جب انہوں نے سنا کہ قبلہ علامہ قاضی صاحب کی ایماء پر میں سندھ یونیورسٹی جارہا ہوں اور آج ہی استعفاء دے کر آیا ہوں، تو خوش ہو کر فرمایا کہ ہاں بھائی جاؤ۔ اور ہمیں بھی لے جاؤ۔ میں نے دل ہی دل میں سوچ لیا کہ ان شاء اللہ قاضی صاحب کو سندھ یونیورسٹی میں بلایا جائے گا۔

(۵)

حیدرآباد سندھ

(۱۹۵۱ء اور اس کے بعد)

یکم ستمبر ۱۹۵۱ء کو جا کر میں نے سندھ یونیورسٹی حیدرآباد سندھ میں پروفیسر آف ایجوکیشن اور صدر شعبۂ تعلیم کی ذمہ داری سنبھال لی۔ اس طرح پاکستان کی تعلیمی تاریخ میں پہلی بار یونیورسٹی سطح پر شعبۂ تعلیم کا اجراء ہوا اور فیکلٹی آف ایجوکیشن قائم ہوئی۔ وائس چانسلر علامہ قاضی صاحب ایک باکمال مفکر ہونے کے علاوہ بڑے تعلیمی مدبر و منتظم بھی تھے اور یونیورسٹی کو صحیح معنوں میں ایک اعلیٰ تربیت گاہ بنانا چاہتے تھے۔ اس سلسلے میں انہوں نے مجھے کلی طور پر اپنے اعتماد میں لیا ہوا تھا۔ تعلیمی شعبوں کا اجراء، تجدید نصاب وغیرہ تعلیمی امور میرے سپرد تھے۔ ۱۹۵۱ء۔ ۱۹۵۲ء کے دوران شعبۂ تعلیم کے بعد شعبۂ دین کا اجراء منظور فرمایا۔ ۱۹۵۳ء۔ ۱۹۵۴ء کے دوران شعبۂ تعلیم کے علاوہ حتی المقدور فیکلٹی آف آرٹس کی تکمیل پیش نظر رہی۔ میں نے تین شعبوں، مسلم ہسٹری، سندھی اور اردو، کو اولیت دینے کا مشورہ دیا۔ اور ساتھ ہی مسلم ہسٹری کے اجراء کے لیے قاضی احمد میاں صاحب کو بلانے کی تجویز پیش کی، قاضی صاحب کی ذاتی صفات اور علمی کارناموں کا ذکر کیا اور کتاب ''طبقات الامم'' کا اردو ترجمہ علامہ صاحب کے سامنے رکھا، جس کو دیکھ کر خوش ہوئے، پھر مجھے اجازت دی کہ میں قاضی صاحب کو لکھوں، تاکہ وہ اک دن کے لیے تشریف لائیں۔ چنانچہ میں نے قاضی صاحب کو لکھا اور وہ میرے ہاں حیدرآباد تشریف لائے اور ہم دونوں مل کر علامہ صاحب سے ان کے گھر جا کر ملے۔ کافی دیر تک گفتگو ہوتی رہی اور علامہ صاحب نے خوش ہو کر قاضی صاحب سے کہا کہ: ہم آپ کو دعوت دیتے ہیں کہ آپ شعبۂ مسلم ہسٹری کے صدر اور پروفیسر کے طور پر ہمارے یہاں یونیورسٹی میں آ جائیں۔ قاضی صاحب

نے قبول کرلیا اور رخصت ہو کر فی الحال واپس کراچی چلے گئے، البتہ یہ پوچھا کہ: حیدرآباد میں ان کے رہنے کے انتظام کا کیا ہوگا؟ علامہ صاحب نے دوسرے روز قاضی صاحب کی تقرری بحیثیت ''پروفیسر آف مسلم ہسٹری'' منظور کرلی، اور جو نئے کوارٹر بنے تھے، ان میں سے ایک قاضی صاحب کے لیے مخصوص کرادیا۔ قاضی صاحب کو ان کی تقرری کا آرڈر ہاتھوں ہاتھ پہنچا دیا گیا اور وہ فوراً حیدرآباد پہنچے اور شعبۂ مسلم ہسٹری کے صدر اور پروفیسر کی ذمہ داری سنبھال لی۔

قاضی صاحب کی آمد کے بعد میں نے حتی المقدور کوشش کی کہ ان کو کوئی تکلیف پیش نہ آئے۔ ڈپارٹمنٹ کی ضروریات کے سلسلے میں رجسٹرار سے خط وکتابت اور مسائل کو حل کرانے میں قاضی صاحب سے میرا کلی طور پر تعاون رہتا تھا اور وہ ہر طرح مطمئن رہے۔ قاضی صاحب حضرت شاہ عبداللطیف کا مزار دیکھنا چاہتے تھے اور ہم ساتھ مل کر وہاں گئے۔ اس طرح ہالا، ٹھٹہ اور مکلی کو گئے۔ دوران گفتگو ذکر کیا کرتے تھے کہ: ان کے آباء واجداد ٹھٹہ سے جونا گڑھ آئے تھے۔ قبلہ علامہ صاحب کے ہاں ہم اکثر ساتھ ہی مل کر جایا کرتے تھے۔ علامہ صاحب قاضی صاحب کو چاہتے تھے اور ان کی قدر کرتے تھے۔

۱۹۵۳ء۔۱۹۵۴ء کے دوران اساتذہ اور طلبہ کی تربیت کے لیے ایکسٹینشن لیکچرس کا سلسلہ علامہ قاضی صاحب کی ایماء پر شروع ہوا۔ یہ لیکچرس ہر جمعہ کو (بعد از نماز جمعہ) مرکزی ہال میں منعقد کیے جاتے تھے اور علامہ صاحب صدارت فرماتے تھے۔ کوئی ایک پروفیسر یا صدر شعبہ اپنے تخصص کے دائرے میں سے کسی موضوع پر مقالہ پیش کرتا تھا اور بعد میں علامہ قاضی صاحب اپنا صدارتی خطاب فرماتے تھے۔ جب ان لیکچرس کا پہلا پروگرام مرتب ہوا، تو قاضی احمد میاں صاحب نے اپنے لیکچر کے لیے ''مسلمانوں کے بعض سائنسی اختراعات'' کا موضوع تجویز کیا۔ انگریزی میں عنوان تھا

''Some Muslim Contributions to Scientific Inventions''

میں نے ان کی طرف سے یہی موضوع لیکچرس کے لیے پروگرام میں لکھوا دیا۔ قاضی صاحب نے اپنا مقالہ انگریزی میں پڑھا اور بعض وضاحتیں فی البدیہ کرتے گئے۔ یہ مقالہ ایک

نئے انداز کا تھا اور دلچسپی سے سنایا گیا اور پسند کیا گیا۔ بعد میں قاضی صاحب سے کاپی لے کر ان کا یہ مقالہ میں نے پندرہ روزہ انگریزی اخبار The Torch مورخہ ۱۵ مارچ ۱۹۵۴ء میں چھپوادیا۔

اسی اثناء میں قاضی احمد میاں صاحب نے ایک اہم تجویز یہ پیش کی کہ بیرونی کی کتاب ''غرۃ الزیجات'' (کہ جو بیرونی نے سنسکرت سے عربی میں ترجمہ کی تھی) کا واحد قلمی نسخہ احمد آباد میں پیر محمد شاہ کی مسجد کے کتب خانے میں پایا جاتا ہے۔ سندھ یونیورسٹی سے اس کا عربی متن نیز اس کا انگریزی ترجمہ مع حواشی وتعلیقات شائع کیا جائے۔

ہم دونوں مل کر علامہ قاضی صاحب سے جا کر ملے۔ علامہ صاحب نے پوچھا کہ: یہ مخطوطہ کیسے حاصل کیا جاسکتا ہے اور یہ کہ کون اس کو انگریزی میں ترجمہ کرے گا اور حواشی لکھے گا؟ قاضی صاحب نے کہا: مخطوطے کے عکس حاصل کرنے کا انتظام میں کروں گا۔ اور یہ کہ اس کے انگریزی میں ترجمے اور حواشی کا کام ایک صاحب بنام فضل الدین قریشی کے سپرد کیا جاسکتا ہے، جو لاہور میں یونیورسٹی یا کسی کالج میں طبعیات کے استاد ہیں، وہ عربی سے مانوس ہیں اور یہ کہ کتاب کا موضوع علم نجوم (Astronomy) ہے اور وہ اس کو سمجھ لیں گے۔

علامہ صاحب نے قاضی صاحب کی یہ سفارش قبول کرتے ہوئے اس منصوبے کی منظوری دے دی۔ قاضی صاحب نے مزید وضاحت کی کہ ڈاکٹر بلوچ میرے ساتھ مل کر اس کام کی نگرانی کریں گے۔ ہم دونوں خوش ہو کر واپس آئے، لیکن قاضی صاحب بہت خوش ہوئے کہ علامہ قاضی صاحب نے ان کی عملی تجویز کو فوری طور پر منظور کرلیا۔

کچھ دنوں کے بعد قاضی صاحب نے مجھے بتایا کہ مخطوطے کے تین عکس لیے گئے ہیں اور وہ کسی صاحب کی وساطت سے عنقریب کراچی پہنچنے والے ہیں۔ عکس پہنچے تو قاضی صاحب نے تجویز کیا کہ فضل الدین قریشی کو بلایا جائے۔ وہ جب آئے تو یہ کام انہیں سپرد کیا گیا۔ قاضی صاحب نے جوان کے لیے اتنی اچھی رائے دی تھی اس کے مدنظر قریشی صاحب کو بعد میں بلا کر فزکس ڈپارٹمنٹ میں مقرر کروایا تا کہ وہ یہاں پر اس کام کو پورا کردیں، افسوس کہ وہ مقررہ مدت

میں یہ کام نہ کر سکے اور واپس لاہور چلے گئے۔ ان کو بار بار لکھا گیا، لیکن انہوں نے ایفائے عہد کے بجائے تغافل سے کام لیا۔

قاضی صاحب کی وفات ناگہانی

سال ۱۹۵۵ء کے شروع سے ہی قاضی احمد میاں صاحب کبھی کبھار علیل ہونے لگے، لیکن یہ علالت ایک دن کی ہوتی تھی۔ اور دوسرے دن وہ آفس میں آجاتے تھے۔ غالباً مارچ میں وہ ایک دن کے بعد دوسرے دن بھی آفس میں نہ آئے، تو میں ان کے گھر جا کر ان سے ملا۔ چارپائی پر بیٹھے ہوئے تھے اور سرہانے کے دونوں طرف کتابیں پڑی ہوئی تھیں۔ میں نے مزاج پرسی کی اور کہا کہ کسی ڈاکٹر سے رجوع کیا جائے۔ فرمایا کہ تشویش کی ضرورت نہیں، مجھے ایک عرصے سے قلب کا عارضہ ''انجائنا'' (Angina) ہے۔ دوا میرے پاس ہے اور ہمیشہ اپنے ساتھ رکھتا ہوں (یہ کہہ کر چھوٹی سفید گولیاں دکھائیں) آرام کر لیتا ہوں، تو طبیعت ٹھیک ہو جاتی ہے۔ چنانچہ دوسرے دن آفس تشریف لائے۔ اس کے بعد کبھی کبھی ایک دن ناغہ کر لیتے تھے۔ تو میں اس کو ''نارمل'' (Normal) ہی سمجھتا تھا۔

۶۔ اگست علی الصباح قاضی صاحب کے گھر سے بچی دوڑتی ہوئی میرے گھر پہنچی اور مجھے کہا کہ: آپ جلدی سے چلیں قاضی صاحب کو کچھ ہو گیا ہے۔ میں فوراً چل پڑا۔ بچی کے ساتھ جب کمرے میں داخل ہوا، تو دیکھا کہ قاضی صاحب اپنی چارپائی پر بالکل سیدھے لیٹے ہوئے ہیں اور ایسا معلوم ہو رہا تھا کہ وہ سو رہے ہیں۔ ایک ٹانگ بالکل سیدھی تھی اور دوسری زانو سے اندر کی طرف مڑی ہوئی تھی۔ آنکھیں بند تھیں۔ ہاتھ دونوں مڑے ہوئے سینے پر دھرے ہوئے تھے۔ میں نے ایک دو آوازیں دیں اور بعد میں ان کی ٹانگ کو اور ہاتھوں کو موڑ کر، بازوؤں کو سیدھا کر دیا۔ میں سمجھ گیا کہ قاضی صاحب فوت ہو چکے ہیں، لیکن اعضاء اتنی آسانی سے مڑ رہے تھے کہ امید ہوئی کہ ایسا شاید نہ ہو۔ اس امید پر میں بھاگ کر حکیم شمس الدین کے داماد، ڈاکٹر بھرگڑی کو بلا کے لایا۔ انہوں نے معائنہ کر کے بتایا کہ قاضی صاحب تقریب دو گھنٹے پہلے فوت ہو چکے ہیں۔ اس سے اندازہ ہوا کہ وہ ۶ اگست کو صبح ۴ بجے کے قریباً فوت ہوئے۔ دونوں ہاتھ

جواُن کے سینے پر رکھے ہوئے تھے، اس سے معلوم ہوا کہ عارضۂ قلب ''انجائنا'' (Angina) جان لیوا ثابت ہوا۔

میں نے قاضی صاحب کے بچوں کو فوراً کراچی روانہ کردیا اور پھر غسل و تجہیز و تکفین کا انتظام کیا۔ قبلہ علامہ قاضی صاحب کو اطلاع دی۔ انہوں نے پوچھا کہ میت کو کراچی پہنچانے کا کیا انتظام کیا گیا ہے؟ میں نے بتایا کہ حیدرآباد میمن جماعت سے ''بس'' ملنے کی امید ہے اور میں خود میت کے ساتھ کراچی جاؤں گا۔ میں نے مزید کہا کہ مناسب ہے کہ پسماندگان سے ہمدردی کے طور پر یونیورسٹی سے ایک ریزولیشن (Resolution) پاس کیا جائے۔ اور رجسٹرار کے دستخط سے بھیجا جائے۔ فرمایا کہ میں خود تعزیت کا پیغام یونیورسٹی کی طرف سے بھیجوں گا اور آپ اپنے ساتھ لیتے جائیں۔ جماعت کی گاڑی دس بجے کے قریب ملی اور نماز جنازہ کے بعد قبلہ علامہ صاحب سے تعزیتی پیغام لے کر میں اکیلا میت کو سنبھالے ہوئے کراچی روانہ ہوا۔ اتفاق سے اس دن جنوب مغرب سے جو روزانہ ہوا چلتی تھی، اس نے بڑی شدت اختیار کرلی۔ کچھ ایسا محسوس ہورہا تھا کہ قاضی صاحب کی وفات پر فطرت بھی جنبش میں آگئی ہے۔ ان دنوں کراچی جانا ہوتا تھا تو براستہ ٹھٹہ جایا کرتے تھے۔ ہم نے جب دابیجی کو کراس کیا تو گاڑی میں پیٹرول ختم ہوگیا۔ پیٹرول تو ہم کافی لے کر چلے تھے، لیکن سامنے کی ہوا کے غیر معمولی دباؤ کی وجہ سے پیٹرول ختم ہوگیا۔ میں نیچے اترا اور گزرنے والی گاڑیوں کو ہاتھ دے کر روکنے لگا۔ موٹر کاروں والے حضرات تو رک کر بھی معذرت کے ساتھ چل پڑے تھے، بالآخر ایک ٹرک کا قلندر صفت ڈرائیور رکا، مجھ سے ہمدردی کی اور دو گیلن کے قریب پیٹرول نلکی (پائپ) سے نکال کردیا۔ جب آگے والے پیٹرول پمپ پر پہنچا تو پیٹرول ڈلوایا۔ اس طرح ان کے آخری سفر میں مجھے قاضی احمد میاں اختر کے ساتھ دو گھنٹے مزید رفاقت کا موقع ملا اور یہ صحبت ہمیشہ کے لیے دل پر نقش ہوگئی۔ اناللہ وانا الیہ راجعون۔

غرۃ الزیجات

قاضی احمد میاں فوت ہوئے اور بعد میں علامہ قاضی صاحب وفات پاگئے۔ میں لاہور

جا کر فضل الدین صاحب سے ملتا رہا اور یاد دہانی کرتا رہا۔ غالباً ۱۹۸۰ء میں یا اس کے بعد میں فضل الدین قریشی سے آخری بار سمن آباد میں ان کے گھر پر جا کے ملا۔ میرے اصرار پر انہوں نے بتایا کہ وہ بیرونی کی ''غرۃ الزیجات'' کا ترجمہ پورا کر چکے ہیں۔ یا پورا کرنے والے ہیں، لیکن اشاعت کے لیے سندھ یونیورسٹی کو دینے میں ان کو تامل تھا۔ کہا کہ بھارت میں کوئی پنڈت ہیں، جو اس کا مقدمہ لکھیں گے اور پھر یہ کتاب پنجاب یونیورسٹی سے شائع ہو گی۔ ساتھ ہی یہ بھی کہنے لگے کہ انہوں نے اپنا ترجمہ یا کتاب کا متن کراچی میں، صمد حسین رضوی صاحب کو بھیجا تھا اور انہوں نے شائع کر لیا ہے۔ بعد میں صمد حسین صاحب سے میری ملاقاتیں ہوئیں، تو معلوم ہوا کہ ان کو ہندو مصنفین کی نجوم پر لکھی ہوئی قدیم کتابوں پر بڑی دسترس حاصل ہے۔ جب وہ اس موضوع کو خوب سمجھتے تھے تو ان کو قریشی صاحب کے ترجمے کو نقل کرنے کی قطعاً ضرورت نہ تھی۔ البتہ صمد حسین صاحب کو ''غرۃ الزیجات'' کا متن قریشی صاحب سے ملا اور یہ اسی متن کا عکس تھا، جو قاضی احمد میاں اختر نے حاصل کیا تھا اور قریشی صاحب کو دیا گیا تھا۔ عبدالصمد صاحب نے مصلحتاً یہ لکھا کہ انہوں نے کتاب کا عکس براہ راست احمد آباد سے حاصل کیا۔ بہر حال عبدالصمد صاحب نے کافی وافی حواشی کے ساتھ انگریزی میں ''غرۃ الزیجات'' پر کامینٹری (Commentary) لکھی اور ان کا یہ کارنامہ ہمدرد فاؤنڈیشن سے شائع ہوا۔ فضل الدین قریشی کے کارنامے کا کیا ہوا، میں معلوم نہ کر سکا۔ میں نے قاضی صاحب مرحوم کی یاد میں ''غرۃ الزیجات'' کے عربی متن پر کام شروع کیا اور بیرونی کی آٹھ سَو سالہ برسی کے موقع پر (جو یونیسکو کے پروگرام کے تحت پاکستان میں منائی گئی) اس کو ۱۹۷۳ء میں سندھ یونیورسٹی سے شائع کیا۔

(٦)

(اسفار ترکی)

(۱۹٦۴ء۔ ۱۹۸۸ء)

ترکی کے کتب خانے دوسرے مسلم ممالک کے کتب خانوں کے مقابلے میں زیادہ تر محفوظ رہے ہیں۔ باوجود اس کے کہ ترکی یورپ سے قریب تر ہے، ترک عالموں نے اپنی کتابوں کو یورپ کی یلغار سے بڑی حد تک بچالیا، جب کہ دوسرے مسلم ملکوں کی کتابیں سستے داموں بک گئیں۔

مسلم یونیورسٹی علی گڑھ میں طالب علمی کے زمانے میں استاد مرحوم پروفیسر عبدالعزیز میمن سے ترکی کے کتب خانوں اور وہاں پر محفوظ نایاب قلمی کتابوں کا تذکرہ سنا، تو ان کو دیکھنے کا شوق دامن گیر ہوا۔ ایک مدت کے بعد جب ترکی جانے کا موقع ملا، تو زیادہ وقت کتب خانوں کی تلاش میں صرف ہوا۔ چنانچہ دور دراز کا سفر کر کے بھی سب کے سب مشہور معروف کتب خانے دیکھے گئے۔ وہاں کے مہمان نواز نگرانوں کی مروّت و مہربانی سے نایاب قلمی نسخوں تک بھی رسائی ہوئی۔

پہلی بار جب سنہ ۱۹٦۴ء میں ترکی جانے کا اتفاق ہوا تو استنبول میں واقع کتب خانوں کو دیکھنے کا موقع ملا۔ اس وقت ڈاکٹر حمید اللہ صاحب بھی پیرس سے آ کر استنبول یونیورسٹی میں تشریف فرما تھے۔ ان کی رہنمائی شامل حال رہی۔ سب سے پہلے استنبول کے ان کتب خانوں کو دیکھا، جن کا تذکرہ خاص طور پر استاد محترم پروفیسر میمن سے سنا تھا۔ وہ تھے کوپرولی زادہ، فاتح (سلطان فاتح کی مسجد کا کتب خانہ) اور سلیمانیہ (سلطان سلیمان خان کی جامع سلیمانیہ) کا کتب

خانہ)۔ذخائر کی کثرت اور وقت کی قلت کا شدید احساس ہوا۔لہٰذا دوسری بار سنہ ۱۹۸۳ء میں تین ہفتوں تک ترکی کے کتب خانوں کو دیکھنے کے لیے رخت سفر باندھا۔اس بار سلیمانیہ کے علاوہ استنبول کے دو مزید مشہور و معروف کتب خانوں ''نورعثمانیہ'' اور ''توپ کاپی سرائی'' (شاہی تاریخی محل) کو دیکھا۔ایک ہفتے کے لیے استنبول سے باہر کا سفر اختیار کیا۔اور قونیہ، برصا، آک حصار، منیسا، اضمیر اور ایدرنے کے کتب خانے دیکھے۔تیسری بار ۱۹۸۸ء میں ترکی جانے کا موقع ملا تو دور دراز کا سفر کر کے مشرقی ترکی کے شہر ''اماسیا'' میں سلطان بایزید مسجد کا کتب خانہ دیکھا۔ تاہم اس سفر میں زیادہ وقت سلیمانیہ میں محفوظ ذخائر کو دیکھنے میں صرف ہوا (ان دنوں عزیزم محمد یعقوب مغل (اب ڈاکٹر) استنبول یونیورسٹی میں تھے اور ان کی رفاقت سے ترکی میں سفر آسان رہا، نیز گفت و شنید میں سہولت ہوئی۔بعد میں بھی ان کی رفاقت شامل حال رہی)۔

سنہ ۱۹۷۴ء میں ایک اہم انتظامی قدم اٹھایا گیا، جس سے سلیمانیہ کو مرکزی کتب خانے کا درجہ دے کر، استنبول اور گرد و نواح میں واقع کتب خانوں کے ذخائر کو سلیمانیہ میں منتقل کر دیا گیا تھا، تاہم ان ذخائر کو ان کی اصلی فہرستوں کے ساتھ ان کے اصلی ناموں سے محفوظ کر دیا گیا۔ سلطان سلیمان خان کی تعمیر کردہ جامع سلیمانیہ کو پہلے ہی سے ایک مرکزی حیثیت حاصل تھی۔ سلطان مرحوم نے جامع کو ایک وسیع رقبے پر بڑے اہتمام سے بنوایا اور مسجد کے ساتھ ساتھ مدرسہ، کتب خانہ، بیمارستان (ہسپتال) اور دوسری عمارتیں تعمیر کروائیں، اس لیے مرکزی کتب خانے کی توسیع کے لیے سلیمانیہ میں کافی جگہ موجود تھی۔البتہ نئی تنظیم کے تحت کتب خانے کو نئے سرے سے تشکیل دے کر پروان چڑھانے کا سہرا اس کے جواں سال منتظم جناب محمد معمر الکر کے سر ہے۔

انتظامی صلاحیت کے علاوہ، ان کے اعلیٰ اخلاق اور کتب خانے میں آنے والے قارئین و محققین کے ساتھ ان کے متواضع اور محبت آمیز برتاؤ نے ان کی شخصیت کو کتب خانے میں ایک روشن شمع بنا دیا۔ اور لکھنے پڑھنے والے پروانہ وار سلیمانیہ کا رخ کرنے لگے۔۱۹۶۴ء تا ۱۹۸۸ء جتنی بار راقم کو سلیمانیہ میں کام کرنے کا اتفاق ہوا، تو جناب محمد معمر الکر نے میرے لیے

مطالعے اور جستجو کے سب مرحلے آسان کر دیے اور ساتھ ہی مہمان نوازی اور محبت سے نوازا۔ ایسے پرلطف ماحول میں کام کرکے، جب سلیمانیہ سے واپسی ہوتی تھی، تو جی چاہتا تھا کہ پھر سے جایا جائے تاکہ مشفق و مہربان محمد معمر سے ملنے کا شرف حاصل ہو۔

جس طرح استنبول میں سلیمانیہ کو مرکزی کتب خانہ بنایا گیا تھا، اسی طرح بعض دوسرے بڑے شہروں میں بھی اسی قسم کا انتظام کیا گیا۔ چنانچہ شہر ''برصا'' میں سلطان عثمان خان کی ''اولو جامع'' سے متصل کتب خانے کو مرکزی پبلک لائبریری قرار دے کر، گرد و نواح کے بعض کتب خانوں کو وہاں منتقل کر دیا گیا۔ اس سے بڑی سہولت پیدا ہو گئی ہے، خاص طور پر باہر سے آنے والے محققوں کے لیے، جو اب برصا کے اس مرکزی کتب خانے میں وہ سب ذخائر دیکھ سکتے ہیں، جو پہلے فاصلوں پر منتشر تھے۔

اس نئے نظام کے ماتحت کتب خانوں کی فہرستیں رومن الف۔ با میں نئے سرے سے مرتب ہو رہی ہیں۔ جو حضرات عربی و فارسی کی کتابوں کے اسماء رومن الف۔ با میں پڑھنے کے عادی نہیں، ان کو تھوڑی دقت ہوگی۔ لیکن عربی رسم الخط میں لکھی ہوئی اصلی فہرستوں کو بھی سنبھال کر رکھ دیا گیا ہے تاکہ جس کو ضرورت ہو، وہ ان کو دیکھ سکے۔ بعض نئی فہرستوں میں اصلی فہرستوں کے نمبروں کا بھی اندراج کر دیا گیا ہے، تاکہ پہلے والے حوالوں کو چیک کرنے میں آسانی ہو۔ راقم جب سلیمانیہ اور برصا کے مرکزی کتب خانوں میں کام کر رہا تھا، تب وہاں کے انتظامی عملے میں سے جو لوگ کتابوں کی دیکھ بھال اور شناخت پر مامور تھے، ان میں سے بعض گذشتہ دور کے فاضل تھے۔ وہ عربی خط سے بھی آشنا تھے۔ ان کی اعانت سے مطلوبہ مخطوطوں کا آسانی سے سراغ لگایا جا سکتا تھا۔

سلیمانیہ میں فاضل نادر رجال اوغلی (''سلیمانیہ کتب خانہ سی باش اوزمائی'' بخطہ) اور کتب خانہ عمومی برصا میں محمد توز (''بورسہ ایل حلق کتب خانہ سی تصنیف اموری'' بخطہ) نے خاص طور پر راقم کی مدد فرمائی۔

مختلف علوم کے ماہرین و محققین کی یلغاروں کے باوجود، ترکی کے کتب خانوں میں

محفوظ نوادرات کا احاطہ تاہنوز نہیں ہوسکا۔ مختلف ذخائر میں جو نادر مخطوطے موجود ہیں، وہ سب کے سب تاحال سامنے نہیں آئے۔ ہر ایک متلاشی، محقق خصوصاً اپنے ذوق کی کتابیں تلاش کرتا ہے۔ بسا اوقات فہرستوں میں جو نام لکھے ہوتے ہیں، ان سے مغالطہ ہوتا ہے، اور مشہور و معروف نام دیکھ کر مخطوطے کو مزید مطالعے کے لیے نکلوایا نہیں جاتا۔ حالانکہ یہ ممکن ہے کہ نام لکھنے میں غلطی ہوئی ہو، اور نام کچھ اور متن کچھ اور ہو۔ بعض مجلدوں میں ایک سے زیادہ مخطوطے ایک ساتھ باندھ دیے گئے ہیں۔ مگر فہرست میں نام صرف پہلے نسخے کا ہوسکتا ہے۔ بعض تصنیفات کے بے نام ٹکڑے بچ گئے ہیں۔ جن کی شناخت کے لیے وقت درکار ہے۔ جب تک ہر ایک مخطوطے کے تفصیلی مطالعے سے ان کی محتویات کا اندراج سامنے نہ آئے، تب تک محض فہرست میں لکھے ہوئے نام سے ان کی شناخت مشکل ہوگی۔

ایک سو سال سے زیادہ عرصے کے دوران البتہ محققوں نے بعض نادر و نایاب کتابوں کا سراغ لگایا ہے۔ اور یہ سلسلہ ابھی تک جاری ہے۔ چند مثالیں ملاحظہ ہوں:

☆ بیرونی کی محققانہ مصنفات میں سے اکثر کے مخطوطے استنبول کے کتب خانوں میں پائے جاتے ہیں، جن میں سے بعض کے متون و تراجم کو پہلی بار گزشتہ صدی میں شائع کیا گیا۔ ۱۸۷۳ء میں جرمن اسکالر ایڈورڈ سخاؤ ''کتاب ماللھند (الخ)'' کے ان نسخوں کا مقابلہ کیا، جو ''نورعثمانیہ'' اور ''کوپرولی'' میں محفوظ تھے اور متن کا مقدمہ لندن سے ۱۹۸۷ء میں شائع کیا۔

☆ بیرونی کی دوسری اہم تصنیف ''الآثار الباقیہ'' کے مخطوطے ایا صوفیا (حالاً در سلیمانیہ) نورعثمانیہ و بایزید اور توپ کاپی سرائی کے کتب خانوں میں محفوظ ہیں، جن کی مدد سے ایڈورڈ سخاؤ نے ۱۸۹۷ میں برلن سے کتاب کا عربی متن شائع کیا۔

☆ ترک محقق مرحوم زکی ولیدی طوفان نے بیرونی کی کتاب ''تحدید نھایات الاماکن لتصحیح مسافات المساکن'' کا واحد مخطوط کتب خانہ فاتح (نمبر ۳۳۸۶) میں دریافت کیا اور اس پر محققانہ مقالہ لکھا، سنہ ۱۹۴۱ء میں ہندوستان کے محکمہ آثار قدیمہ کے ''میمائر نمبر ۵۳'' کے طور

پر دہلی سے شائع ہوا۔ بعد میں طنجہ (مغرب) کے فاضل محقق مرحوم محمد بن تاویت الطنجی (۱) نے اس نادر مخطوطے کا پورا متن شائع کیا۔

☆ بیرونی کی ''کتاب الصید نہ'' کا سنہ ۶۷۸ھ میں لکھا ہوا قدیم نسخہ برصا کے مرکزی کتب خانے (رقم ۱۴۹) میں محفوظ ہے (اصل میں یہ نسخہ کتب خانہ قشون لو اوغلو کا ہے جس کے ذخیرہ کو بُرصا پبلک لائبریری میں لایا گیا ہے) جس کے ساتھ مقابلہ کر کے ہمدرد فاؤنڈیشن پاکستان سے اس کا متن شایع ہوا۔ راقم نے کتب خانہ برصا میں بیٹھ کر، اس مخطوطے کو شروع سے آخر تک پڑھا اور اس میں جڑی بوٹیوں، عقاقیر اور ادویہ کے جو سندھی اور ہندی نام پائے جاتے ہیں، ان کو ان کی صحیح صورتوں میں ضبط کرنے کی کوشش کی۔

بیرونی نے سنسکرت سے جن کتابوں کا عربی میں ترجمہ کیا، ان میں سے صرف دو باقی بچ گئی ہیں۔ ایک ''پاتنجلی'' اور دوسری ''کرن تلک''۔ (کرن تلک کا بیرونی نے ''غرۃ الزیجات'' کے نام سے عربی میں ترجمہ کیا، جس کا واحد مخطوبہ احمد آباد ہندوستان میں پیر محمد شاہ کے مزار کے کتب خانے میں محفوظ ہے۔ راقم نے اس کو مزید تصحیح و تحقیق کے ساتھ، پہلی بار سنہ ۱۹۷۳ء میں سندھ یونیورسٹی سے شائع کیا۔) پاتنجلی کا مخطوطہ (کتاب پاتنجل فی الخلاص من ارتباک) استنبول کے کتب خانہ کوپرولی زادہ میں (نمبر ۱۵۸۹ قتبہ ۶۸) محفوظ ہے، جس کو جرمن مستشرق ہلمٹ رٹر نے دریافت کیا اور اس پر کام کیا۔

بیرونی نے ہندوؤں کے مذہبی اعتقادات کے سلسلے میں خصوصاً ''بھاگ ودگیتا'' اور پاتنجلی'' کا محققانہ مطالعہ کیا، اور ان اعتقادات کی فلسفیانہ بلکہ موحدانہ تشریح کی طرف توجہ دلوائی۔ کوپرولی زادہ میں محفوظ ''کتاب پاتنجل الھندی'' کے متن کے شروع والے الفاظ (بیرونی کے عربی ترجمے کی صورت میں) جو راقم نے مخطوطے سے قلمبند کیے، بصیرت افروز ہیں۔

''امجد لمن لیس فوقه شئ و امجد من هو مبدأ (إلا له؟)

(میں اس کی تمجید کرتا ہوں، جس سے اوپر اور کوئی چیز نہیں، اور اس کی تمجید کرتا ہوں جو عبودیت کا مبدأ ہے)

ترجمے کے آخر میں بیرونی نے اپنے ارادے کا اظہار کیا ہے کہ وہ عن قریب ہندوؤں کی تہذیب پر ایک تفصیلی کتاب لکھیں گے۔

"وسأعمل بإذن الله کتابا فی حکایه شرایعهم والابانة من عقائدهم والاشـــارة الی مواضعاتهم واخبارهم وبعض المعارف فی ارضهم وبلادهم یکون عـــدة لمن رام مداخلهم ومخاطبتهم إن یشاء الله فی الاجل وکشف المواضع من المقام العلل۔"

بیرونی نے بعد میں "کتاب مالھند" لکھ کر اپنے اس ارادے کی تکمیل کر دی۔

بیرونی کی جواہرات کے متعلق کتاب "الجماہر فی معرفۃ الجواہر" کا واحد مکمل مخطوطہ کتب خانہ توپ کاپی سرای استنبول میں محفوظ ہے۔ جس کے ساتھ مقابلہ کر کے پروفیسر کرینکو نے اس کا متن سنہ ۱۳۵۵ھ میں حیدرآباد دکن سے شائع کیا۔ بعد میں اس متن پر مبنی انگریزی ترجمہ جناب حکیم محمد سعید، صدر ہمدرد فاؤنڈیشن پاکستان کی مساعی جمیلہ سے تیار ہوا، جو مزید تنقیح و تحقیق کے ساتھ، راقم کے زیر نگرانی نیشنل ہجرہ کونسل اسلام آباد سے ۱۹۸۹ء میں شائع ہوا۔

صنعت اصطرلاب پر بیرونی کی محققانہ تصنیف "کتاب الاستیعاب فی وجود الممکنہ فی صنعۃ الاصطرلاب" کا مخطوطہ سلیمانیہ میں کتب خانہ ایا صوفیا (رقم ۲۵۷۶) میں محفوظ ہے۔ راقم نے اس کا نسخہ، ۲۷ دسمبر سنہ ۱۹۷۳ء کو کچھ لمحوں کے لیے دیکھا۔ شروع کے الفاظ سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ کتاب بیرونی نے ابوسہل عیسیٰ بن یحییٰ الطبری کے لیے لکھی (اسی سفر میں الاستیعاب کا دوسرا مخطوطہ (غالباً دسویں صدی کا؟) راقم نے تہران میں کتب خانہ ملک ملی میں رقم ۳۳۱۹ پر دیکھا)۔

یہ تو بیرونی کی مصنفات کا ایک موضوع تھا۔ جس پر ترکی کے کتب خانوں میں محفوظ نادر مخطوطوں کا تذکرہ ہوا، لیکن دوسرے علوم وفنون پر بھی نایاب قلمی نسخے محفوظ ہیں، جن کی اہمیت کو ان علوم وفنون کے ماہرین سمجھ سکتے ہیں، مثلاً عربی شعر و ادب کے متعلق استاذ مرحوم پروفیسر میمن نے نادر مخطوطات کا سراغ لگایا، جو استنبول کے کتب خانوں میں پائے جاتے ہیں۔ چند مثالیں جو استاذ مرحوم کی دستخط شدہ یادداشتوں سے منقول ہیں، ملاحظہ ہوں۔

۱۔دیوان امرئ القیس،بروایه ابی سحل خربنداز، کتب خانہ ولی الدین آفندی در بایزید (رقم ۲۶۸۴)

۲۔تمثال الامثال، تصنیف قاضی القضاۃ جمال الدین أبی المحاسن محمد بن علی بن محمد بن ابی بکر القرشی العبدری الطیبی المکی الشافعی سنه ۸۴۵ھ کی تصنیف، کتب خانۂ نور عثمانیہ (رقم ۳۷۵۳)

۳۔کتاب الایام ،تصنیف الفراء، کتب خانه لاله لی (رقم ۱۹۰۳)

۴۔مسائل نافع بروایة ابن الانباری، کتب خانۂ فاتح، رقم ۴۸۴۵، وکتب خانہ ملا مراد (رقم ۳۰۹)

۵۔کتاب طبقات النحویین واللغویین من البصریین والکوفیین، تالیف الامام العلامة أبی بکر محمد بن الحسین الزبیدی، کتب خانۂ نور عثمانیہ (رقم ۳۳۹۱)

۶۔رسالة الوزیر أبی القاسم الحسین بن المغربی الی ابی العلاء ابن سلیمان المعری وأخیه۔ کتبخانۂ کوپرولی زادہ رقم ۱۳۹۶ نسخہ جیدۃ، ورقم ۱۲۷۲ ھی ردیئۃ)

ایک جگہ پر استاد نے یہ لکھا ہے کہ وقت کے بڑے ادیب ابو مسلم (۳۰۵ھ۔۳۹۹ھ) کی علمی وادبی مجلسوں کے تذکرے "مجالس ابی مسلم" کا نایاب نسخہ کتب خانہ کوپرولی زادہ میں محفوظ ہے۔

حال ہی میں ترک محقق وصاحب معارف فواد سزگین نے (فرینکفورٹ سے) نادر اسلامی مخطوطات کی اشاعت کا جو سلسلہ شروع کیا ہے اور کئی جلدیں چھپ چکی ہیں، ان میں کافی مخطوطات وہ ہیں، جو ترکی کے کتب خانوں میں محفوظ ہیں۔ بہر حال جو محقق ومتلاشی ترکی کے کتب خانوں کو دیکھتا ہے، تو اس کو اپنے علم وقیاس کی روشنی میں نایاب مخطوطے نظر آتے ہیں۔ اس

کی ادنیٰ مثال راقم کی ہے۔ جب مجھے علمائے سندھ و ہند کی مصنفات کی تلاش میں ترکی کے کتب خانوں کو دیکھنے کا شرف حاصل ہوا، تو مختلف موضوعات پر ایسی کتابیں نظر آئیں، جو میرے محدود علم و قیاس کی روشنی میں گویا نوادرات میں سے تھیں۔ چند مثالیں ملاحظہ ہوں۔

☆ جدول السہام: یہ جدول ایک ورق (دو صفحون) کا مخطوطہ ہے اور بیرونی کی تصنیف ہے۔ ۱۹۶۴ء میں میں نے اس کو کتب خانہ عثمانیہ (رقم ۷/۸۸۲۴/۲۵۳۳) استنبول میں دریافت کیا۔ غالباً اس سے پہلے یہ ورق کسی کے علم میں نہ آیا تھا۔ سنہ ۱۹۷۳ء میں شائع کردہ ''غرۃ الزیجات'' کے ایڈیشن میں، میں نے بیرونی کی تصنیفات کے سلسلے میں اس کی نشان دہی کر دی ہے۔

☆ عجائب الدنیا، تصنیف المسعودی، کتب خانہ حسین چلبی حالاً در سلیمانیہ (رقم ۶۳۷ عمومی)

☆ مختصر من سیرۃ رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وسلم) تألیف عبدالرزاق، کتب خانہ ایل حلق منسیا (رقم ۱۳۳۲) قدیم نسخہ غالباً قرن سابع یا ثامن کا لکھا ہوا۔

☆ معارف مولانا شمس الملۃ والدین التبریزی، سنہ ۷۰۱ میں لکھا ہوا یہ مخطوطہ کتب خانہ ایل حلق منیسا (رقم ۱۹۹۷) محفوظ ہے۔ شمس تبریزی کے اقوال پر مبنی ہے اور اس موضوع پر نہایت ہی اہم کتاب میری دانست میں کسی محقق نے اس سے فائدہ نہیں اٹھایا تھا۔ لیکن بعد میں ایران کے فاضل دکتر ناصر الدین صاحب الزمانی کی تالیف بعنوان ''خط سیوم'' (تہران مرداد ماہ، ۱۳۵۱ شمسی، ۱۹۷۲ء) نظر سے گذری یعنی ''خط سیوم در بارہ شخصیت سخنان و اندیشۂ ی شمس تبریزی'' جس سے معلوم ہوا کہ دکتر ناصر الدین نے غالباً کتب خانہ منسیا کے مذکورہ مخطوطے سے فائدہ اٹھایا۔

☆ احصاء الایقاعات: تصنیف فارابی، یہ مجموعۂ مخطوطات، کتب خانہ ایل حلق منیسا میں، رقم ۱۷۰۵ پر محفوظ ہے۔ ایک ہی مجلد میں موسیقی پر دس مختلف رسائل کا مجموعہ ہے، جس میں فارابی کا ''احصاء الایقاعات'' نمبر ۲ پر ہے۔ اس میں تانوں کی تشریح ہے، جو اس فن پر

سب سے پہلی تشریح ہے۔ بعض تانوں ،ترانوں اور ان کے ادوار کو حروف صناعت (Notations) سے واضح کیا گیا ہے۔ مثلاً ''ایک نوٹیشن اس طرح ہے:

تنن تنن تنن	تنن تنن تنن
الدور الاول	الدور الثانی
فقرۃ (؟) المجاز	فقرۃ (؟) الاعتماد

ہندوستانی موسیقی میں ''تان'' کا مفہوم عرب، ترک ایرانی موسیقی سے آیا، جس کا خالق غالبًا فارابی تھا ''تان'' ہی کی مناسبت سے بعد میں لفظ ''تال'' (ضروب کے معنوں میں) استعمال ہوا۔

علمائے سندو ہند کی تصنیفات، ترکی میں

جن کتب خانوں میں یہ مصنفات محفوظ ہیں، ان کتب خانوں کے ناموں اور ان کی فہرستوں میں مرقوم نمبروں سے ہر ایک کتاب کی شناخت کردی گئی ہے۔ بعض مخطوطات کو راقم نے نکلوا کر دیکھا اور کتاب اور مصنف کے ناموں کی تصدیق کی۔ لیکن اکثر کے صرف نام جس طرح فہرستوں میں لکھے گئے تھے، اسی طرح قلم بند کر لیے۔ ضمیمے میں بھی یہ نام اسی طرح لکھے گئے ہیں، تاکہ فہرستوں کی ورق گردانی کرتے وقت شناخت میں آسانی ہو، البتہ کسی ایک ہی کتاب اور اس کے مصنف کا نام، جدا جدا فہرستوں میں مختصر کر کے کئی جدا جدا صورتوں میں لکھا گیا ہے۔ ضمیمے میں بھی یہ نام ان ہی صورتوں میں دیے گئے ہیں۔ تاہم اہل علم کو کسی بھی کتاب یا اس کے مصنف کا صحیح نام سمجھنے میں دشواری نہیں ہوگی۔

بعض اہم کتابوں میں سے مثال کے طور پر چند کا ذکر ضروری سمجھتا ہوں، کیونکہ باوجود ان کی اہمیت کے، اہل علم کے ہاں بھی یہ کتابیں اتنی معروف نہیں۔

واردات فی التصوف

یہ حضرت غوث بہاء الدین زکریا کی تصنیف ہے اور کتب خانہ فاتح (حالاً در سلیمانیہ) میں رقم ۲۸۹۰ پر محفوظ ہے۔ کتاب کے شروع میں مصنف کا نام جس ادب واحترام سے لیا گیا

ہے، اس سے بھی تصدیق ہوتی ہے کہ یہ تصنیف حضرت غوث بہاء الدین زکریا کی ہے۔

"الحمد لله رب العالمين والصلوة على سيدنا محمد وآله الطاهرين قال الشيخ الامام العالم الكامل المحقق المدقق قطب الاولياء العارفين سلطان العلماء فى العالمين بهاء الملة والحق والدين قدس الله روح ونور ضريحه"

تفسیر تبصیر الرحمٰن وتفسیر المنان:

یہ بمبئی (مھیم) میں مدفون عالم، شیخ زین الدین علی بن علی الأموی المہائمی کی مشہور ومعروف تفسیر ہے اور چھپ چکی ہے۔ اس کا ایک قدیم مخطوطہ سلیمانیہ میں کتب خانہ داماد ابراہیم پاشا (رقم ۱۲۷) میں محفوظ ہے، جو مصنف کی وفات (۸۳۵ھ) کے چونسٹھ سال بعد شوال ۸۹۹ھ میں لکھا گیا۔

شفاء المشتفی وکفالیۃ المکتفی فی شرح خواص القرآن

یہ مخطوطہ سلیمانیہ میں کتب خانہ ایا صوفیا میں (رقم ۳۸۲) کے تحت محفوظ ہے۔ یہ نویں صدی ہجری کا نسخہ ہے، جس کو کاتب مفتی محمود بن محمد بن جلال الحسین نے جمعے کی شب ۱۹ رمضان سنہ ۸۴۸ھ میں لکھ کر ختم کیا۔ اصل تصنیف امام تمیمی (؟) کی تھی، جس کی محمد بن عبداللہ بن محمد الحسینی نے اصلاح کی اور نئے سرے سے اس کو گیارہ ابواب میں مرتب کیا۔ مصنف حسینی، مکران کے جید عالم تھے اور شہر تربت میں پیدا ہوئے۔ ان کی ولادت کم از کم آٹھویں صدی ہجری میں ہوئی ہوگی۔ جس سے ظاہر ہے کہ شہر تربت اس وقت اہل علم کا مولد ومسکن (۲) تھا۔ فاضل مصنف نے اپنی شرح وتفسیر کا مقدمہ اس طرح لکھا ہے:

يقول العبد الراجى رحمة ربه الأحد، ليجيريه من سكرات الموت وضيق اللحد، أبو اسحاق محمد بن عبدالله بن محمدالحسينى المكرانى محتدا، التربتى مولدا (فقد) وقع لى كتاب عتيق بخط...نيق على قرطاس قد أصابه الماء وهو فى شرح بعض آيات القرآن العظيم، تاليف الامام التميمى رضى الله عنه وهويرد على بعض حكماء الهند، فوجدته فى غاية السقامة

ونهاية التحريف، فبذلت مجهودى حتى حصل لى الوقوف على بعض التصحيف، فاردت أن التقط منه ما كثرت الحاجة اليه۔ورتبته على مقدمة، ما فتح بها الكتاب، يتلوه احد عشر بابا ،وسميته شفاء المشفى و كفاية المكتفى۔

ضوء القند فی قدح الزند

تصنیف سامور الہندی (۳)، جو سلیمانیہ میں کتب خانہ بغداد لی دھی افندی (رقم ۹۷۲) میں محفوظ تھا، متاسفاً میں اس کتاب کے مخطوطے کا مطالعہ نہ کر سکا۔ سامور غالباً وہی نام ہے جو پرتگیز یوں کے یہاں ''زامورتن'' کی صورت میں لکھا گیا ہے۔ یہ کتاب اصل میں سامور نے ہندی (جنوبی ہند کی کسی زبان) میں لکھی، اور صالح بن یحییٰ ابو الفتح المغربی المالکی مراکشی (۴) نے اس کا عربی میں ترجمہ کیا ہے۔

کتاب جمع المناسک ونفع الناسک (۵)

یہ علامہ رحمت اللہ بن القاضی عبداللہ السندی (وفات ۹۹۳ھ) کی مشہور ومعروف تصنیف ہے۔ فاضل مصنف اصل میں سندھ کے تاریخی شہر دربیلہ (حالاً ضلع نوشہرو فیروز) کے رہنے والے تھے۔ انہوں نے ایک سو سے زیادہ ماخذوں کے مطالعے سے یہ کتاب صفر سنہ ۹۵۰ھ میں لکھ کر پوری کی۔ اصل جامع متن کے علاوہ اس کتاب کے دو اور مختصر متن ''المتوسط'' اور ''الصغیر'' بھی متداول ہے۔ ترکی کے ان کتب خانوں میں اس کتاب کے کئی مخطوطے پائے جاتے ہیں۔ ان میں اقدم اور جید نسخے کتب خانہ جمع بایزید والا (رقم ۱۹۳۱) ہے، جس کو کاتب احمد بن مصطفیٰ العودی الرومی نے، رجب ۱۰۷۹ھ میں لکھ کر پورا کیا۔

فہرست تصانیف علمائے سندھ وہند در مکتبات ترکیا

امیر خسرو، فیضی اور ابوالفضل جیسے مشہور ومعروف شعراء اور ادباء کی کتابوں کے علاوہ سندھ وہند کے بعض علماء وفضلاء کی مصنفات کے اسماء اسی فہرست میں موجود ہیں۔ سب سے زیادہ بہتات فاضل استاذ ملا عبدالحکیم بن شمس الدین سیالکوٹی (۶) کے ''حواشی'' کی ہے۔ انہوں نے درسی کتابوں کے متون پر، یا ان متون پر پہلے سے لکھے ہوئے حواشی پر، یا ان حواشی کے حواشی

پر حاشیے (Explanatory notes) لکھے، تا کہ طلبہ کو کسی قسم کی دشواری نہ ہو۔ ایسے تدریسی حواشی کے علاوہ بعض علماء نے مستقل موضوعات پر کتابیں لکھیں جن کا مطالعہ ضروری ہے۔ ان میں سے بعض تو مشہور ہیں لیکن بعض اتنی معروف نہیں اور تا ہنوز تحقیق طلب ہیں۔ مثلاً:

☆ سراج الدین عمر بن اسحاق غزنوی ہندی، جس کی دو کتابیں ''فتاوی قاریٔ الہندیہ'' اور ''شرح بدیع'' محفوظ ہیں۔

☆ مسعود بن شیبہ بن الحسین السندی: التعلیم فی الرد علی الغزالی

☆ علی بن حسام الدین الہندی: شرح جامع الصغیر

☆ محمد بن عبداللہ الہندی: کتاب حکم الشورد۔

☆ شیخ محمد حیات السندی: الانوار المحمدیه فی الاسرار النقشبندیه۔

☆ امام اللغہ حسن صغانی لاہوری: مشارق الانوار (جس کا قدیم نسخہ سنہ ۶۴۴ھ کا لکھا ہوا، قونیہ میں مولانا رومی کے موزہ کے کتب خانے میں محفوظ ہے)۔ صغانی نے سنہ ۶۵۰ھ/ ۱۲۵۲ء میں وفات پائی۔

کتب خانہ بایزید، استنبول، تاسیس ۱۳۰۰ھ

۶۳۱	حاشیة علی البیضاوی	عبدالحکیم سیالکوتی
۱۹۳۱/ ۶۷	کتاب جمع المناسک ونفع الناسک(۱) (تحریر رجب ۱۰۷۹ھ۔)	ملا رحمت اللہ بن قاضی عبداللہ السندی
۲۸۶۱	حاشیة علی الجلال (یعنی شرح التهذیب لمیر جلال)	عبدالحکیم سیالکوتی
۴۳۰۶	حاشیة علی التصدیقات(یعنی تصدیقات شرح الشمسیه لقطب الدین شیرازی	عبدالحکیم سیالکوتی

۴۳۵۶	حاشیة علی السید	عبدالحکیم سیالکوتی
۴۴۵۵	حاشیة علی التصورات	عبدالحکیم سیالکوتی
۶۴۴۰	حاشیة علی عبدالغفور	عبدالحکیم سیالکوتی
۵۹۸۵ ۵۹۸۹	حاشیة علی المطول (پانچ نسخے)	عبدالحکیم سیالکوتی
۵۸۱۷ ۵۶۷۸	دیوان امیر خسرو (دو نسخے)	

کتب خانہ ولی الدین افندی (اب بایزید کے ساتھ) تاسیس ۱۱۷۵ھ، استنبول

۲۰۱۴	حاشیة علی شرح المواقف	عبدالحکیم سیالکوتی
۲۲۰۰	حاشیة علی التصدیقات	عبدالحکیم سیالکوتی
۲۷۷۰	حاشیة علی المطول	عبدالحکیم سیالکوتی
۲۷۷۲	حاشیة علی السید(یعنی علی شرح المفتاح لسید شریف)	عبدالحکیم سیالکوتی
۳۲۲۹	مجموعۂ رسائل (جملہ دس جن میں سے ایک) رسالۂ رباعیات امیر خسرو دہلوی (فہرست کے آخر میں نئے نمبروں کا اندراج:)	

۱۸۱۹	مجموعۂ رسائل (جملہ ۲۵، جن میں سے ایک): ''قصیدۃ من معقولات امیر خسرو دہلوی المسمی بجیر الابرار لجۃ الاسرار، وارد در جواب میر خسرو الدہلوی'' (فہرست میں عنوان اسی طرح ہے۔ اصل مخطوطہ دیکھ نہ سکا۔ امیر خسرو پر تحقیق کرنے والے کے لیے دیکھنا ضروری ہے۔)	

(آگے اور نئے نمبروں کا اندراج):

۹۶ (ص:۲۸۱)	حاشية على شرح الرسالة الشمسية	عبدالحکیم سیالکوتی

<u>کتب خانہ نور عثمانیہ، استنبول</u>

۵۳۱	حاشية على البيضاوى	عبدالحکیم سیالکوتی
۱۵۲۰_۲۲	خزانة الروايات فى الفروع الحنفية (تین نسخے)	قاضی جگن الہندی
۲۱۱۸	حاشية على حاشية الخيالى	عبدالحکیم بن شمس الدین السیالکوتی
۲۱۳۱	حاشية على شرح المواقف	ایضاً
۲۱۲۳	حاشية على شرح العقائد النسفية	ایضاً
۳۱۵۴، ۳۰۸۱	تاریخ اکبری (دو نسخے)	ابو الفضل موسیٰ بن مبارک
۳۸۱۷_۳۸۲۰	دیوان امیر خسرو دهلوی (چار نسخے)	

<u>کتب خانہ، کوپرولی زادہ محمد پاشا، استنبول</u>

(فہرست قسم اول)

۸۴۔۸۷	تفسیر تبصیر الرحمان وتیسیر المنان (چار نسخے)	زین الدین علی بن احمد الہندی
۱۱۳	تفسیر الهندی بالحروف المهمله	شیخ فیض اللہ الہندی
۴۹۰	حاشیة علی شرح مختصر المنتهی	عضد الدین سیف الدین احمد اللاہوری
۹۸۱	مفتاح الطب	ابوالفرج علی بن الحسن الہندی
۱۲۹۹	موارد الکلم	ابوالفضل بن مبارک الہندی
۱۵۸۱	مجموعة رسائل فیها: رسالة فی تفسیر سورة الفاتحه ورسالة ''دیباچۂ دیوان شیخ فیض الله هندی''	شیخ فیض اللہ الہندی

(فہرست قسم سیوم)

۲۰۵	حاشیة علی الخیالی	عبدالحکیم سیالکوتی
۳۰۰	حاشیة علی التصورات	ایضاً
۳۰۱	حاشیة علی التصدیقات	ایضاً
۴۸۹	حاشیة علی المطول	ایضاً
۵۶۳	حاشیة علی عبدالغفور	ایضاً

کتب خانۂ فاضل احمد پاشا (کوپرلی کے ساتھ)

شرح جامع الصغیر (فتح الکبیر)	علی بن حسام الدین الہندی

کتب خانۂ رشید افندی، سلیمانیہ، استنبول

۲۸۲	رسالة فی التصوف	شیخ محمد حیات السندی

کتب خانۂ سی روز، سلیمانیہ، استنبول

۳۱۳	حاشیة علی انوار التنزیل	عبدالحکیم سیالکوتی
۹۸۳	لباب المناسک وعباب المسالک، کتابت ۱۰٦۵ھ	رحمت اللہ السندی
۱۱۴۷	حاشیة علی حاشیة الخیالی علیٰ شرح العقائد النسفیه (۱۳۱۷ تک جملہ ۸ نسخے)	عبدالحکیم سیالکوتی
۱۲۵٦	حاشیة علی شرح الجلال علی العقائد العضدیه (۱۳۰۲ تک جملہ ٦ نسخے)	ایضاً
۲۱۳۲	حاشیة علی التصدیقات من شرح القطب علی الشمسیة (اور بھی نسخے)	ایضاً
۲۱۳۳ ۲۱۴۵	حاشیة علی حاشیة السید علی شرح القطب علی الشمسیة (۱۳ نسخے)	ایضاً
۲۴۳۲	حاشیة علی المطول	ایضاً
۳۰۸٦ ۳۰۸۹	شرح الکافیه	شہاب الدین الہندی
۳۲۳۰ تا ۳۲۴۰	حاشیة علی حاشیة عبدالغفور علی الفوائد الضیائیه (۱۱ نسخے)	عبدالحکیم سیالکوتی

کتب خانۂ قاضی عسکر ملا چلبی، سلیمانیہ، استنبول

۲۵، ۲۷، ۲۹	شرح المغنی (۳ نسخے)	سراج الدین الہندی
۷۲	مجمع البحرین	حسن صغانی

کتب خانۂ گولنوش ولیدی سلطان، سلیمانیہ، استنبول

اس کتب خانے اور کتب خانۂ ہاشم افغانی کی دونوں فہرستیں ایک ہی جلد میں ہیں۔

۲۷۴، ۱۷۶	جمع المناسک (دو نسخے)	رحمت اللہ الہندی (کذا والصواب السندی)
۵۰۸	حاشیة علی الخیالی	عبدالحکیم سیالکوتی
۶۵۳	حاشیة علی المطول	ایضاً
۶۷۳	حاشیة شرح التصورات	ایضاً
۶۷۷	حاشیة علی عبدالغفور	ایضاً

(ذخیرہ ''گلنوش والدہ''، اس اندارج کے بعد)

۱۰۰	بیان الحق فی المباحث المذهبیه	مترجم: خواجہ اسکندر بن محمد کشمیری

<u>کتب خانۂ اوزنجان ملی، سلیمانیہ، استنبول</u>

۱۵۶/۸	حاشیة علی شرح علی الکشجو السمرقندی علی العضدیه	میر ابوالبقا بن عبدالباقی

<u>کتب خانۂ مدرسۂ سرویلی، سلیمانیہ، استنبول</u>

۱۶۴	حاشیة علی شرح العقائد العضدیه	عبدالحکیم سیالکوتی
۲۸۶	حاشیة علی حاشیة الجامی	ایضاً

<u>کتب خانۂ جامعہ شریفی، سلیمانیہ، استنبول</u>

۹۱	جامع مفردات القرآن	محمد مراد کشمیری
۵۰۵	حاشیة علی الجلال	عبدالحکیم سیالکوتی
۶۳۸	حاشیة علی عبدالغفور (الجزء الاول)	ایضاً
۶۳۹	حاشیة علی عبدالغفور (الجز الثانی)	ایضاً

<u>کتب خانۂ عاشر افندی، سلیمانیہ، استنبول</u>

۵۷	تفسیر القرآن	علی بن سلطان محمد القاری
۳۲۶	خزانة الروایات	قاضی جگن الحنفی الهندی
۴۹۴	کتاب حکم الشوارد	محمد بن عبداللہ الهندی
۶۰۱	تاج المآثر فی احوال ملوک الهند	صدر الدین محمد بن حسن النظامی
۹۲۶	موارد الکلم	لابی الفیض (فیضی) الهندی

کتب خانہ توپ کاپی سرای، استنبول

EH۱۸۹۸ ۷۷۹۴	حاشیة السیالکوتی علی حاشیة اللاری	عبدالحکیم سیالکوتی

کتب خانہ، حسین پاشا، تاسیس ۱۱۶۸ھ، سلیمانیہ، استنبول

۲۲	تفسیر تبصیر الرحمن (تحریر نسخہ ۸۹۲ھ)	علی المھائمی

کتب خانہ یحییٰ افندی، سلیمانیہ، استنبول

۶۱۳	حاشیة علی شرح الشمسیة للتصورات	عبدالحکیم سیالکوتی
۲۱۶	حاشیة علی شرح الشمسیة للتصدیقات	ایضاً

کتب خانہ مصلی مدرسہ، سلیمانیہ استنبول

(اس کی فہرست: کتب خانہ یحییٰ افندی کی فہرست کے ساتھ ایک ہی جلد میں۔ نمبر دونوں کے الگ)

۱۰۵	مناسک الحج (غالباً ''الصغیر'') رواجی نسخہ	رحمت اللہ الحنفی
۱۲۵	حاشیة علی حاشیة الخیالی علی شرح العقائد النسفیه	عبدالحکیم سیالکوتی

کتب خانہ ولی الدین جار اللہ افندی، سلیمانیہ، استنبول

۱۱۹۰	حاشیة علی الخیالی علی النسفی	عبدالحکیم سیالکوتی

کتب خانہ حمیدیہ، سلیمانیہ، استنبول

۸۸	تفسیر الهندی بالحروف المهمله	شیخ فیض اللہ الہندی
۱۰۹۲	دیوان خسرو دهلوی	امیر خسرو

کتب خانہ لالا اسماعیل افندی، سلیمانیہ، استنبول

(اس کتب خانے کی فہرست، حمیدیہ کی فہرست سے ملحق۔ نمبر جداگانہ)

۴۴۱	دیوان امیر خسرو	

کتب خانہ مراد محمد مراد افندی، سلیمانیہ، استنبول

(کتب خانہ، حبیب اللہ افندی، کتب خانہ مراد افندی، کتب خانہ شاذلی تکیہ اور کتب خانہ توفیق افندی کی فہرستیں۔)

۱۱۶۷	تعلیقات علی حاشیة السیالکوتی علی الخیالی	ضیاء الدین شیخ خالد بغدادی
۱۳۲۶	الانوار المحمدیه فی الاسرار النقشبندیة	شیخ محمد حیات السندی
۲۵۷۴ ۲۵۷۵	خمسۂ امیر خسرو (۲ نسخے)	

۲۶۳۰ ۲۶۲۹	دیوان خسرو (۲ نسخے)	
۲۶۸۰	دیوان فیضی	
۲۸۵۰	قصائد امیر خسرو دهلوی	
۲۹۵۴	"موارد الکلم:	شیخ ابو الفضل ابن المبارک الہندی
۳۲۲۲	شرفنامه فی اللغه الفارسیه منیری (والصحیح غالباً فرهنگ)	قوام فاروقی
۳۴۴۰	مجموعۂ فیضی	
۳۶۱۳	مجموعة رسائل (جس میں ایک رسالہ) غاية التحقيق ونهاية التدقيق فی الصلوٰة	للشیخ (رحمت اللہ) السندی
۳۶۳۱	مجموعة رسائل (جس میں ایک رسالہ): فی الاقوال الحنفيه فی الاقتداء بالشافعیه	للشیخ (رحمت اللہ) السندی الحنفی (اس پر دو مہریں ۱۱۳۹ھ۔۱۱۵۱ھ
۳۷۰۲	مجموعة رسائل (جس میں): قصیده امیر خسرو دهلوی ونظيرة قصيدة دهلوی للجامی	

کتب خانہ داماد ابراہیم پاشا، سلیمانیہ، استنبول

۱۲۷	تفسیر تبصیر الرحمن وتیسیر المنان للشیخ زین الدین علی بن احمد الاموی المھایمی (مھیم، بمبئی) المتوفی ۸۳۵ھ۔ تفسیر کا یہ نسخہ مصنف کی وفات کے ۶۴ برس کے بعد لکھا ہوا ہے اور اس لئے اہم ہے۔	
۱۲۸	تفسیر بے نقط (سواطع الالہام)	الفیضی الہندی المتوفی سنہ ۹۴۴ھ (کذا)(۷)

<u>کتب خانہ لالہ لی (تاسیس ۱۲۱۷ھ)، سلیمانیہ، استنبول</u>

۱۴۱	قطعة من تفسیر تبیان	فیضی ہندی تالیف ۱۰۰۲
۱۴۲	التفسیر المسمی بسواطع الالہام	تصنیف فیضی ہندی
۸۳۹	التعلیم فی الرد علی الغزالی(۸)	تصنیف سلطان المحققین مسعود بن شیبہ بن حسین السندی
۱۰۲۱	شرح معدل الصلوٰة	ابوالحسن بن محمد صادق السندی
۱۷۴۴	دیوان امیر خسرو دھلوی	
۱۸۹۶	کلیات فیضی ھندی	
۲۱۰۲	حاشیة علی الجلال	عبدالحکیم سیالکوتی

<u>کتب خانہ عمومی (تاسیس ۱۳۰۰ھ) سلیمانیہ، استنبول</u>

۱۹۳۱	جمع المناسک (یعنی مناسک الحج)	عبداللہ السندی، (کذا۔ والصحیح غالباً رحمت اللہ بن عبداللہ السندی)

کتب خانہ بغدادلی وہبی افندی، سلیمانیہ، استنبول

۹۷۲	ضوء القندفی قدح الزند، سامور الهندی	نقله من الهندیه الی العربیه صالح بن یحیٰی ابو الفتح المغربی المالکی المراکشی

کتب خانہ ایاصوفیہ (تاسیس ۱۲۵۰) سلیمانیہ، استنبول

۲۹۴۹	اخبار دولت ملک ابی منصور سبکتگین: یعنی یمینی، یہ ایک خاصا قدیم نسخہ ہے جو محرم ۵۷۳ھ میں لکھا گیا	
۴۲۱۲	خمسۂ امیر خسرو دهلوی	
۴۷۱۰ ۴۷۰۹	فرهنگ جهانگیری (دو نسخے)	عبدالرشید ٹھٹوی

کتب خانہ یحیٰی توفیق افندی، سلیمانیہ، استنبول

پرانا نمبر/ نیا نمبر		
۹۰/۱۴۰۳	افاضات الانوار فی اضاعات(؟)	سعدالدین الدهلوی
۲۱۶/۱۵۲۶	حاشیة علی الشمسیة	عبدالحکیم سیالکوتی
۳۶۹/۱۶۶۹	حاشیة علی حاشیة عبدالغفور علی الجامی	ایضاً
۳۸۴/۱۶۸۵	شرح علی الکافیه	شهاب الدین الهندی

(الف اور ب اسی فہرست میں، ایک ہی جلد میں)

(الف) ینی مدرسہ کتابلاری، سلیمانیہ، استنبول

۲۳۰/۱۸۸۳	حاشیة علی الفوائد الضیائیه	عبدالغفور

۲۴۴	ظفر الامانی فی مختصر الجرجانی	عبدالحی لکھنوی
۳۲۲	انجاح الحاجه من حاشية ابن ماجه	عبدالغنی دہلوی
۳۵۲_۵۶	شرح مشکوة المصابیح (پانچ جلدوں میں)	علی القاری
۳۶۰	مؤطا الامام محمد بن الحسن الشیبانی والتعلیق(التعلیق الممجد)	عبدالحی لکھنوی
۳۹۸	شرح تراجم ابواب الصحیح للبخاری	ولی اللہ الدہلوی
۴۴۳	الآثار المرفوعة	عبدالحی لکھنوی
۴۹۹	النامی شرح الحسامی	ابومحمد عبدالحق الدہلوی
۵۲۵	الانصاف فی بیان سبب الاختلاف	ولی اللہ الدہلوی
۶۷۲	حجة الله البالغة	ایضاً
۸۱۴	امام الکلام	عبدالحی لکھنوی
۸۱۸	القول الجازم فی المصافی الراقم	عبدالحی لکھنوی
۸۶۹	حاشية علی الجلال	عبدالحکیم سیالکوتی
۹۹۷	اظهار الحق مع التنبیهات	رحمت اللہ الہندی
۱۰۵۲	مجموعه فیها:تنویر الاذهان	محمد زکی الدین السندی

کتب خانہ قلیچ علی پاشا، سلیمانیہ، استنبول

۳۰۶	شرح المغنی	سراج الدین الہندی
۶۱۷	الفتوحات الانسیه فی تحقیق رموز الصوفیه۔	علیم اللہ اللاہوری

۶۵۱	حاشیة القطب	عبدالحکیم سیالکوتی

کتب خانہ قاضی عسکر ملا چلبی، سلیمانیہ، استنبول

۲۵۔۲۷	شرح المغنی (تین نسخے)	سراج الدین الہندی
۷۲	مجمع البحرین	صغانی

کتب خانہ برہان الدین، سلیمانیہ، استنبول

۱۰۷	حاشیة علی شرح العقائد العضدیه لجلال الدین الدوانی	عبدالحکیم سیالکوتی

کتب خانہ حسن پاشا، سلیمانیہ، استنبول

۱۱۰	تفسیر مزهر (مظهری) (مطبوع)	محمد ثناء اللہ الہندی
۴۱۹	حاشیه التلویح	عبدالحکیم سیالکوتی
۵۳۱	شرح بدیع	سراج الدین الہندی
۱۲۷۶	شرح تذکره الهیه	عبدالحکیم سیالکوتی

کتب خانہ مہر شاہ سلطان (تاسیس ۱۲۱۰) سلیمانیہ، استنبول

۲۹۴	مجموعة فیها: شرح عقیده الطحاوی	سراج الدین ابی العباس (؟) عمر الہندی

کتب خانہ عمومی، بُرصا

(عثمانی طاقت کے تاریخی شہر برصا کے عمومی (پبلک) کتب خانے میں بھی گرد ونواح کے کئی چھوٹے کتب خانوں کے ذخیرہ یکجا محفوظ کردیے گئے ہیں)

۸۹۶	(کتب خانہ اورخان)	حاشیة علی التصدیقات لسید شریف علی شرح مطالع الانوار	عبدالحکیم سیالکوتی
۱۱۸۴	(ایضاً)	دیوان امیر خسرو دهلوی	

۱۱۲۱	(ایضاً)	حاشیة علی عبدالغفور	عبدالحکیم سیالکوتی
۵۹۲	عمومی (۲۳۸خصوصی خزانچی اوغلو کتب خانہ)	مناسک الج(المتوسط)	الامام (رحمت اللہ) السندی
۹۷۸	عمومی (۱۷خزانچی)	دیوان خسرو دهلوی	
۱۴۵	(۱۰۔کتب خانہ حسین چلبی)	شرح نخبة الفکر المسمی بالتوضیح	وجیہ الدین نصر علوی گجراتی
۴۰۰	عمومی (۴۔حسین چلبی)	فتاویٰ قاری الهندیه	سراج الدین عمر بن اسحاق الغزنوی الہندی
۳۱۰۳	(کتب خانہ اولو جامع)	مجموعة رسائل منها رساله الاسئله والاجوبه	شیخ محمد حیات السندی
۱۲۳۰	(جنرل)	خمسة امیر خسرو دهلوی	
۱۷۸۳۴	(جنرل)	حاشیة علی عقائد النسفی	عبدالحکیم سیالکوتی

کتب خانہ منیسا

۱۳۲	سواطع الالهام	فیضی الہندی
۲۶۰/ ۲۵۷	مشارق الانوار	صاغانی لاہوری
۴۹۰۰، ۴۸۸۵، ۳۴۴۰	حاشیة شرح العقائد النسفیة (تین نسخ)	عبدالحکیم بن شمس الدین سیالکوتی
۳۴۹۶	حاشیة انوار التنزیل	ایضاً

۵۵۰۷ ۴۶۷۴	حاشیة علی شرح المواقف	ایضاً
۴۸۶۱	حاشیة علی شرح المواقف	ایضاً
۵۴۸۱	حاشیة علی المفتاح	ایضاً
۵۵۷۲	حاشیة علی شرح التصوف(؟)	ایضاً(؟)
۶۶۲۹	کتاب فی المنطق	ایضاً(؟)

کتب خانہ سلیمیہ، جامع ایدرنے

۵۶ES/ ۲۱۳۱YE	کنز الھدایات فی کشف البرایات	محمد باقر بن شرف الدین لاھوری
۲۱۶۲/۲۳۰	سر گزشت نامۂ منظوم(ترکی)	محمود ہندی
۱۳/۱۷/۱۲۸۹	تعلیقة علی شرح العقائد للسیالکوتی (بغدادی کی تعلیق شرح العقائد للسیالکوتی پر)	خالد ضیاء الدین بغدادی

کتب خانہ بایزید، اماسیا

۱۵۷	مشارق الانوار (نسخہ ۹۵۸ھ)	صغانی لاہوری
۱۹۰	فتاویٰ ھندی(جلد ثانی)	للفاضل الہندی (کذا)

کتب خانہ یوسف آغا، قونیا

صفحہ۴/۲۰۹۴	مرآۃ الصفا	امیر خسرو

کتب خانہ مولانا میوزے، قونیا

۶۵۳	مشارق الانوار (نسخہ ۸۴۴ھ)	صغانی لاہوری

تعلیقات وحواشی

(۱) محمد بن تاویت طنجی (ت:۱۳۹۴ھ) مشہور عربی ادیب، ترکی زبان پر بھی عبور رکھتے تھے، استنبول میں الٰہیات کالج میں اسلامک کلچر کے استاد رہے۔ کافی کتب ایڈٹ کر کے چھپوائیں۔

(۲) تربت مکران اہل علم کا مولد ومسکن تھا۔ اس کا دوسرا شاہد ''مشیخۃ الامام المراغی'' (ابی بکر بن الحسین بن عمر القرشی، ت:۸۱۶ھ) کا وہ خطی نسخہ ہے، جو دارالکتب المصریہ، قاہرہ میں رقم ۹۷ پر محفوظ ہے، اس کی کتابت سنہ ۸۱۵ھ میں (یعنی مؤلف کی زندگی میں) کیچ (تربت) مکران کے ایک عالم وکاتب ابوبکر بن محمد بن منصور الکیچی المکرانی نے کی، یہ کتاب اسی ہی خطی نسخہ کو سامنے رکھ کر اُم القریٰ یونیورسٹی، مکہ مکرمہ والوں نے شایع کردی ہے۔ تیسرا شاہد ''الانشراحات الزکیۃ فی شرح العقیدۃ الحافظیۃ'' نامی کتاب ہے، جس کا مؤلف محمد بن حاجی بن خطیب مکرانی ہے۔ اس کا واحد خطی نسخہ ۷۲۴ھ کا لکھا ہوا، پشین، بلوچستان میں، صاحبزادہ حمیداللہ شاہ کے پاس محفوظ اور اس کا فوٹو محترم سید احسان اللہ صاحب کے پاس کوئٹہ میں موجود ہے۔

(۳) سامور ہندی کے حالت زندگی نہ مل سکے، البتہ اس کی ایک دوسری کتاب ''الخافی فی الطب'' کا ذکر حاجی خلیفہ چلپی نے ''کشف الظنون'' میں کیا ہے۔

(۴) شاید اس سے مراد، صالح بن یحییٰ (ت:۸۵۰ھ) ہے، جو بڑا تاریخ دان تھا، علم نجوم اور علم اصطرلاب میں بھی مہارت تامہ رکھتا تھا۔

(۵) ''جمع المناسک'' کو عموماً ''منسک کبیر'' کے نام سے یاد کیا جاتا ہے۔

(۶) ملا عبدالحکیم سیالکوٹی (ت:۱۰۶۷ھ) بڑا عالم وفاضل تھا، معقولات شیخ کمال الدین کشمیری سے، اور حدیث شیخ عبدالحق محدث دہلوی (ت:۱۰۵۲ھ) سے حاصل کی، جو شیخ حمید دربیلی (ت:۱۰۰۹ھ) کا شاگرد تھا۔

(۷) کذا، یعنی اس طرح لکھا ہوا ہے، ورنہ صحیح تاریخ وفات ملا فیضی کی ۱۰۰۴ھ ہے۔

(۸) اس کتاب التعلیم کا مقدمہ، سندھی ادبی بورڈ کی طرف سے شایع ہوا تھا۔

محاضراتِ میمنی

(استاذ عبدالعزیز المیمنی ، ت:۱۹۷۸ء کے مورخ علمی ارشادات)

استاذ عبدالعزیز المیمنی (مرحوم) علمی دنیا میں ایک غیر معمولی شخصیت کے مالک تھے۔ عربی لغت، شعر وادب میں یکتائے روزگار تھے۔ دوسرے متعلقہ علوم و معارف میں بھی ان کی معلومات نہایت وسیع اور عالمانہ تھیں۔علوم اسلامیہ وعربیہ کے انحطاط والے تشویشناک ماحول میں اس برصغیر میں استاذ عبدالعزیز میمن جیسے جبل العلم کا پیدا ہونا اور پنپنا ایک معجزے سے کچھ کم نہیں تھا۔قوت حافظہ کچھ ایسا پایا تھا، کہ اسی برس کے لگ بھگ عمر میں بھی وہ ایک چلتی پھرتی انسائیکلوپیڈیا تھے۔

آخری عمر بہادر آباد، کراچی میں گوشۂ تنہائی میں بسر کی۔۱۹۴۱ء میں جب کہ راقم الحروف ایم۔اے عربی کے طالب علم کی حیثیت سے مسلم یونیورسٹی علی گڑھ پہنچا تو استاذ میمن اس وقت پروفیسر وصدر شعبۂ عربی تھے۔بی۔اے تک کالج کی تعلیم کا مرکز ومحور چند درسی کتابیں تھیں، جن کو ٹائم ٹیبل کے مطابق پڑھایا جاتا تھا اور ہم ان درسی کتابوں کو ہی رٹ کر امتحان میں اچھے نمبر لیتے تھے۔شعبۂ عربی علی گڑھ میں جب استاذ میمن کے سامنے آئے تو ان کے لیکچروں کا طریقہ کچھ اور پایا۔درسی کتاب کا متن تو پڑھا لیتے تھے،لیکن زیادہ وقت متن کے خاص نکات،اشعار و معانی کی تشریح وتوضیح میں صرف کیا کرتے تھے۔اور پھر بات سے بات نکلتی تھی اور عربی شعر وادب کے وسیع میدان میں کہیں سے کہیں جا نکلتے تھے۔

متقدمین کے مصادر ومأخذوں کی نشان دہی کرتے، اور کبھی مخطوطات کے نادرو نایاب نسخوں کے عرض وجوہر کو بیان فرماتے۔ ایم۔اے کے پہلے سال میں تو ہم میمن صاحب کے لیکچروں کو کچھ ضرورت سے زیادہ محسوس کرنے لگے، البتہ ایک سال کی صحبت کے بعد جب ہم ۱۹۴۲ء میں ایم۔اے فائنل میں منتقل ہوئے تو جا کر ہوش سنبھالا کہ استاذ میمن ہی اعلیٰ تعلیم کے معیار کو برقرار رکھتے ہوئے صحیح معنوں میں ہمیں علمی مباحث ومصادر سے روشناس کراتے ہیں، بلکہ علم کا دریا بہا دیتے ہیں تاکہ کوئی بھی طالب علم تشنہ لب نہ رہ جائے۔

استاذ کا علم وفضل تو ہمارے احاطۂ ذہن سے باہر تھا، لیکن راقم کو کچھ ایسا محسوس ہوا کہ عربی ادب کے متعلق استاذ کے ارشادات گرامی اتنے قیمتی ہیں، کہ ان کو اپنی رہنمائی کے لیے قلم بند کرتا جاؤں۔ یہ خیال ایک مدت تک دامن گیر رہا لیکن دسمبر ۱۹۴۲ء میں، میں نے اس کو عملی جامہ پہنانا شروع کیا۔ چنانچہ شام کو ٹہلتے وقت استاذ کی صحبت میں جب کبھی علمی باتیں ہوتیں، تو رات کو کمرے میں آکر جو کچھ یاد رہ جاتا تھا لکھ لیتا تھا۔

یہ ایک طالب علم کی ڈائری ہے جس میں وہ سب نقص موجود ہیں، جو ایک ایم۔اے کے طالب علم کی لکھی ہوئی یادداشت میں ہو سکتے ہوں۔ خاص طور پر ایسا طالب علم کہ جس نے ۱۹۴۱ء۔۱۹۴۲ء میں جو کچھ لکھا، وہ استاذ نے املاء نہیں کرایا، بلکہ جس طرح ان سے سنا اور سمجھا گیا، اس کو گھنٹوں بعد حافظے سے لکھا۔ لہٰذا اس یادداشت کو ایک طالب علم کی خامیوں پر محمول کیا جائے اور استاذ المیمنی کی طرف ان کو قطعی منسوب نہ کیا جائے۔

میں جناب ڈاکٹر نجم الاسلام کا ممنون ہوں کہ انہوں نے اس ڈائری کو بتمامہ اپنے بیش بہا مخزن تحقیق میں شائع کرنے کی ترغیب دی، خود ہی مسودے کو پڑھا، صاف کیا اور اس کو احسن طریقے پر شائع کیا۔ قبلاً اس کے صرف چند اجزاء چھپے تھے۔

۱۸ نومبر ۱۹۹۷ء۔

نبی بخش

دسمبر ۱۹۴۲ء

استاذ نے یہ اشعار پڑھے اور فرمایا کہ دمامینی (۱) کے ہو سکتے ہیں، مگر غالباً متاخرین میں سے کسی کے ہیں۔ پھر یہ اشعار اپنے قلم سے لکھ کر دیے:

أيا علماء الهند طال بقاؤكم
وزال بفضل الله عنكم عناؤكم
رجوتم بعلم العقل فوز سعادة
وأخشى عليكم أن يخيب رجاؤكم
فلا في تصانيف الأثير هداية
ولا في إشارات ابن سينا شفاؤكم
ولا طلعت شمس الهدى من مطالع
فأوراقها ديجوركم، لا ضياؤكم
أخذتم علوم الكفر شرعا كأنما
فلاسفة اليونان هم أنبياؤكم (۲)

۲۸ دسمبر ۱۹۴۲ء

استاذ نے فرمایا کہ سیوطی (۳) نے اپنی تصانیف میں نقالی سے کام لیا ہے، اور اس میں اس کے علم وفضلیت کا مبلغ زیادہ بلند نہیں۔ سیوطی کی تصانیف (۴) کا فائدہ اس وقت صرف یہ ہے کہ مصنف نے جن کتب سے حالات نقل کیے، وہ آج کل معدوم ہیں۔ فرمایا کہ شرح شواہد المغنی (۵) از روئے علم ونظر کچھ کام کی نہیں۔ جو اشعار کامل مبرد میں آئے ہیں، ان کا بھی پتا نہیں لگا سکا۔ فرمایا کہ شواہد کے سلسلے میں عبدالقادر بغدادی (۶) کی تین تصانیف (خزانۃ الادب فی شرح الکافیہ للرضی، شرح الشافیہ للرضی، شرح مغنی اللبیب) بے نظیر ہیں، حالانکہ بغدادی بہت بعد کا ہے

(خزانۃ الأدب فی شرح الکافیہ للرضی، اور شرح الشافیہ للرضی چھپ گئی ہیں۔شرح مغنی اللبیب نہیں چھپی) فرمایا کہ مرآۃ الزمان لسبط ابن الجوزی (۷) ایک بے نظیر کتاب ہے اور چھٹی صدی کے حالات اس میں لکھے گئے ہیں، اس کے متعلق مصنف ثقہ ہیں (۸) اور کوئی تصنیف ان حالات میں اتنی معتبر نہیں۔یعنی حروب صلیبیہ کے حالات جو اس جلد میں ہیں، نایاب ہیں، ابن جوزی ان کے نانا تھے اور حنبلی تھے۔ سبط خود دمشق میں آگئے تو ملک معظم عیسیٰ سے وابستگی کی وجہ سے حنفی ہوگئے۔فرمایا کہ ''مرآۃ الزماں''، تاریخ ''کامل'' لابن الاثیر (۹)، کے درجے کی ہے اور اس سے کچھ کم نہیں۔ابن الاثیر کے بعد تک کے کچھ حالات ''مرآۃ الازمان'' میں موجود ہیں۔سبط دمشق میں اور ابن اثیر بغداد میں تھا۔

استاذ ''معجم الادباء (۱۰)'' کے حواشی لکھ رہے ہیں (اب وہ مجمع العلمی دمشق میں ۱۹۶۵ء۔۱۹۶۶ء اور ۱۹۶۷ء میں چھپ چکی ہیں (۱۱)) استاذ نے فرمایا کہ ''معجم الأدباء'' میں نے سات آٹھ مرتبہ پڑھی اور ابن خلکان پر (۱۲) اس کو ترجیح دیتا ہوں۔اس سلسلے میں بتایا کہ کیسے مارغیولوث نے رشید بن زبیر اور اس کے بھائی مہذب کے دو قصائد میں جو انہوں نے ایک دوسرے کے جواب میں لکھے، فاحش غلطی کی ہے اور مہذب کے دو قصیدے کے مطلع کو، رشید کے مطلع کے اول میں ضم کر دیا ہے۔استاذ نے اس کی تصحیح اپنے مبینہ مسودے کے صفحہ ۳۰ پر کی ہے، جو انہوں نے دکھائی اور رشید کا مقامہ ''أمنیۃ الألمعی ومنیۃ المدعی'' جو، اور شر نے استاذ کو قسطنطنیہ میں دیا تھا، وہ دکھایا۔ اس مقامہ کے نام میں بھی مارغیولوث پوری تحقیق نہیں کر سکا اور ''منیۃ المدعی'' کے بدلے ''بلغۃ المدعی'' لکھ دیا ہے۔

استاذ نے فرمایا کہ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ رشید بڑا علامہ و فاضل تھا۔ وقت کی سیاست میں ماہر تھا۔اس مقامہ سے ظاہر ہے کہ وہ انشاء کا استاذ تھا اور اس قصیدے سے ثابت ہوتا ہے کہ اعلیٰ درجے کا شاعر تھا۔استاذ نے فرمایا کہ یہ قصیدہ (ادباء میں) اتنا خوب صورت ہے کہ میں اس کی داد نہیں دے سکتا۔

میں ''انساب'' سمعانی (۱۳) میں اہل سند کے تذکرے دیکھ رہا تھا۔استاذ نے فرمایا کہ

سمعانی نے محدثین کے چند نام دیے ہوں گے اور فرمایا کہ وہ عربی علماء جن کا ہندوسند سے تعلق رہا، ان کے متعلق اتنے منتشر معلومات ہیں کہ ان کو کہاں تک خیال میں رکھا جائے۔ فرمایا کہ فلاں نحوی اس کے متعلق میں نے کل ایک کتاب میں دیکھا کہ وہ ہندوستان میں آیا ہے، حالانکہ یہ اطلاع اس کے متعلق صرف اسی ایک کتاب میں ہے، دوسری جگہ اس کے ترجمے میں موجود نہیں۔ ابن نجار مؤرخ (۱۴) جس نے ''ذیل تاریخ بغداد'' لکھی وہ لاہور میں آیا تھا۔

تقریباً ۲۲ دسمبر ۱۹۴۲ء کو استاذ نے شعراء جاہلیہ کے اشعار و دیوان کے متعلق یوں فرمایا:

''اشعار ستہ'' اعلم شنتمری (۱۵) کی کتاب پر مستشرق اہل ورڈٹ نے ڈاکہ ڈالا اور اس کو ''عقد ثمین'' کا نام دے کر شائع کر دیا۔ اعلم نے ستہ (۱۶) کو منتخب کیا اور شرح لکھی۔ ''اشعار ستہ'' اندلس میں کورس میں داخل تھی، چنانچہ ابوحیان غرناطی (۱۷) نے لکھا ہے کہ ''اشعار ستہ'' دیکھ رہے تھے۔ امرؤالقیس کے شعر کے متعلق اعلم شنتمری کی روایت نصف تک پہنچتی ہے۔ پوری روایت قدیم ترین اور بہترین ابوالحسن الطّوسی کی ہے جو ابوعبیدہ (۱۸) کے شاگرد ہیں اور ایک دوسری روایت ابوسعید خربنداز عن ابی جعفر الکوفی المعروف بدندان کی ہے۔

استاذ نے فرمایا کہ چونکہ مجھے امرؤالقیس کے دیوان پر کام کرنے کا خیال تھا، اس لیے میں دونوں روایتیں اپنے دوران سفر نقل کروا کے لایا تھا۔ لیکن ابھی فرصت نہیں کہ اس کام میں ہاتھ ڈالوں، حالانکہ امرؤالقیس کے شعر، دیوان وغیرہ کے متعلق جتنے معلومات میرے ہاں جمع ہیں، غالباً اتنے اور کہیں نہیں ہیں، اور جتنا درجہ امرؤالقیس کو دیا گیا ہے، اتنی ہی کم توجہ اس کے شعر پر کی گئی ہے۔ دوسو برس پہلے ''اَغانی (۱۹)'' کے (نقل کردہ) اشعار، امرؤالقیس کے (نام) چھاپ دیے گئے۔ لیکن یورپ والوں نے پورا دیوان نہیں چھاپا۔ ضرورت ہے کہ طوسی کی روایت کو چھاپا جائے، کیونکہ ''امالی (۲۰)'' کے مصنف بھی اس کو نقل کرتے ہیں۔ اور اس کا مقابلہ خربنداز کی روایت سے کیا جائے۔

۱۔ زہیر (۲۱) کے دیوان کی روایت شنتمری ایک تہائی تک پہنچتی ہے۔ دیوان زہیر (۲۲) مکمل مصر میں چھپ چکا ہے، مع دیوان کعب بن زہیر کے۔

۲۔عنترۃ (۲۳) کا دیوان صرف اشعار ستہ سے مل سکتا ہے۔

۳۔عروۃ (۲۴) کے دیوان کی ایک روایت اعلم اور ایک ابن سکیت سے ہے۔ یہ دونوں چھپ چکے ہیں۔

۴۔دیوان علقمۃ (۲۵) صرف اشعار ستہ میں موجود ہے، اور الجزائر سے علاحدہ بھی چھپ چکا ہے۔ابن ابی شنب نے اس کو ایڈٹ کیا ہے۔

۵۔طرفۃ: مکمل روایۃ ثعلب کوفی کی ہے۔اشعار ستہ میں جو ہے، اعلم شنتمری کی شرح کے ساتھ چھپ چکی ہے۔

<u>شروح بر دواوین</u>

☆ امرؤالقیس (بطلیوسی کی شرح)

☆ نابغۃ (۲۶) (خمس دواوین العرب میں چھپی۔ اعلم والی روایت چھوڑ دی گئی)

☆ طرفۃ (۲۷) (اعلم کی روایت، فرانس میں چھپ چکی)

☆ علقمۃ (محمد بن ابی شنب الجزائری نے اعلم کی شرح چھاپی)

☆ عروۃ (ابن سکیت (۲۸) کی شرح)

☆ زہیر (لائیڈن میں اعلم والی شرح چھاپی گئی، نیز مصر میں ثعلب کوفی (۲۹) کی شرح دارالکتب والوں نے چھاپی)

☆ لبید (۳۰) (ابوالحسن الطّوسی کی روایت جس) کی جلد دوم کو خالدی نے ویانا میں ایڈٹ کیا۔

پہلی جلد کو لیڈن میں ہوور نے چھاپا، ابھی کویت والوں نے چھاپ دیا ہے۔

☆ شرح دیوان زہیر نسخۂ خطیہ مکتبۃ الاسکوریال میں موجود ہے۔

☆ شرح بطلیوسی جر.جی ۱۱، ج ۲، ڈیرن بورغ نے فرانس میں چھاپی، دوبارہ ساوہ میں۔ جو چھٹی صدی میں کاتب نے لکھی، اس کو اسی مستشرق نے شایع کرا دیا۔

☆ امرؤالقیس اور نابغۃ کی شرحیں جو بطلیوسی نے لکھیں چھاپ دی گئیں اور اعلم شنتمری کو چھوڑ دیا گیا۔ شنتمری Santa Maria ہے۔ جو پورچوگال میں ہے(۳۱)۔ ''اعلم'' کے معنی ہیں اوپر کا ہونٹ کٹا۔ مخروط الشفۃ العلیا''

☆ عمرو بن کلثوم وحارث بن حلزۃ، دونوں کے نسخے سلطان محمد فاتح کے کتب خانے میں ہیں۔ کرنکو نے بیروت سے چھاپ دیے۔ ماخلا المعلقات (یعنی نسخہ قسطنطنیہ والے میں بھی معلقات نہیں۔ لکھا ہے کہ ''ماخلا المعلقات''

☆ اعشی، اسکوریال نسخہ بروایت ثعلب، گایر نے شایع کیا، لیکن پوری طرح پڑھ نہیں سکا۔ استاذ نے فرمایا کہ گایر نے چالیس سال اس کتاب پر کام کیا اور اس کے طبع میں اس نے بسلسلہ اعشی اتنی کثیر تعداد میں کتابوں کے حوالجات دیے ہیں کہ میں نہیں سمجھتا کہ کسی نے بھی اپنی تصنیف میں اتنی کتب کو رجوع کیا ہو۔ لیکن یہ اس کا رجوع کرنا بالکل مہمل اور فائدے سے خالی ہے۔ مثلاً: وہ لکھتا ہے کہ فلانی فلانی کتب میں اعشی کا نام آیا ہے۔ اب اس سے کیا حاصل، ایسے حوالجات صرف حماقت۔

گایر کو خود استاذ نے کتب خانہ رامپور سے اعشی کے دیوان کے نسخے سے تقابلہ وتصحیح کر کے بھیجا تھا، لیکن متن پہلے چھپ چکا تھا۔ گایر نے استاذ کا شکریہ ادا کیا ہے۔

استاذ نے فرمایا کہ میں آپ کو علم کا ایک خلاصہ اور راز بتا دیتا ہوں، وہ یہ کہ

۱۔ علم کو کتابوں کے مقابلے سے وسیع اور پختہ کرو، جو کچھ ہے وہ مقابلہ ہے، بشرطیکہ مقابلہ غائر نظر سے کیا جائے، اس سے اصل حقیقت، مصنفوں کا علم میں درجہ، ان کی غلطیاں وغیرہ سب کچھ معلوم ہو جائے گا۔

۲۔ کسی کتاب کو حقیر مت سمجھو اور ضرور اس کو دیکھو کیونکہ نسبتاً دوسری تصنیف سے گھٹیا ہو، لیکن جس وقت و ماحول میں وہ لکھی گئی ہے، اس میں دوسری نہیں لکھی گئی۔ اس وجہ سے بہت سے فائدے اس کے مطالعے سے حاصل ہوں گے۔ فرمایا کہ مجھ جیسے انسان کو یہ ضرورت نہیں کہ شذرات الذہب جیسی کتاب کے حوالے دے، لیکن میں نے سوچا کہ شاید کوئی فائدے کی

بات ہو جائے۔ اس لیے میں نے اس کو اٹھایا اور دیکھا کہ مصنف کے سامنے ایک ابن اھدل نام کے شخص کی تاریخ بھی موجود تھی، چنانچہ میں نے دیکھا کہ جو تحریر ابن اھدل سے نقل کی گئی ہے اس میں سے بہت اچھے معلومات حاصل ہو جاتے ہیں۔

۲۹ دسمبر ۱۹۴۲ء

استاذ نے فرمایا کہ بعد کی جو یہ شروحِ شواہد لکھی گئی ہیں، ان میں ''خزانۃ الادب'' (۳۲) ممتاز ہے۔ اس سے پہلے علماء نے جو شروحِ شواہد لکھی ہیں، وہ ضرور قابل قدر ہیں۔ فرمایا کہ شواہد کے اکثر ابیات رضی کی شرح کافیہ میں آجاتے ہیں، باقی کچھ تھوڑے دیگر کتب مثلاً ''مغنی اللبیب'' میں ملتے ہیں۔ سیبویہ کے شواہد نیز رضی (کے شواہد) مغنی اللبیب میں آجاتے ہیں۔

تاہم سیبویہ کی کتاب کے شواہد پر پہلے غالباً ابومحمد بن السیرافی (۳۳) نے لکھا ہے، جس کا نسخہ قسطنطنیہ میں کتب خانہ محمد سلطان احمد ثالث میں موجود ہے۔ اسی کا ردّ ابومحمد اسود اعرابی نے لکھا ہے۔ استاذ نے فرمایا کہ یہ میرے پاس موجود ہے اس کا نام فرحۃ الأدیب) ہے۔ مصر میں اصل موجود ہے۔ لیکن میرے ہاں زیادہ صحیح نسخہ ہے۔

اعلم شنتمری نے شرح لکھی جو مصر کے ایڈیشن میں خود متن کے ساتھ چھپی ہوئی ہے۔ پھر اندلس میں شواہد سیبویہ، ابومحمد یوسف بن اُبوسعید السیرافی نے لکھی، جس کا نسخہ میں نے قسطنطنیہ میں دیکھا، اور شاید ایک ہی نسخہ دنیا میں رہ گیا ہے۔ اس شرح پر ابومحمد اسود الاعرابی نے فرحۃ الادیب نام رد لکھا جو میرے ہاں موجود ہے (۳۴)۔

فرمایا کہ ملک النحاۃ حسن ابن صافی (۳۵) (شذرات الذہب) نیز ہندوستان میں آیا تھا۔ میں نے دریافت کیا کہ اس کا تذکرہ کہاں ملتا ہے؟ فرمایا کہ میری تصحیح اُدباء سے سب پتہ چل جائے گا۔

سیبویہ کی کتاب میں ایک ہزار شواہد ہیں، جن میں سے ۹۵۰ شواہد اُن کے استاذ الجرمی (؟) کو معلوم تھے، باقی پچاس ان کو بھی معلوم نہ تھے۔ دوسروں نے کوشش کی اور شنقیطی نے ایک شعر کا پتہ چلایا۔ استاد نے پھر مزید دو کا پتہ چلایا۔

شاید شروع دسمبر ۱۹۴۲ء

حسب ذیل معلومات، استاد نے ایک روز اپنی گفتگو کے دوران میں بیان کیے تھے اور کچھ اشارات میں نے قلم بند کر لیے تھے، لیکن صرف دلچسپی کے لیے۔ اب چونکہ میرا ارادہ ہے کہ جو کچھ بھی استاذ کی زبان سے عربی ادب سے متعلق نکلے قلم بند کر لوں، لہٰذا میں ان اشارات کو بھی قلم بند کر لیتا ہوں۔

فرمایا کہ دو پرانے علماء جن کا ہند سے تعلق رہا ہے۔ بڑے علامۃ الدھر تھے۔ ایک ابوبکر دمامینی (۳۶) اور دوم امام صاغانی لاہوری (۳۷)۔

ابوبکر دمامینی مصر کے جید عالم تھے۔ ابن ہشام نے ابو حیان غرناطی کی کتاب کے مقابلے میں، ''مغنی اللبیب'' لکھی۔ ابوحیان اندلس چھوڑ کر مصر میں آیا اور اس کا وقار کافی بڑھ چکا تھا۔ تاہم ابن ہشام (۳۸) نے اپنے حسد کا ثبوت دیا۔ ابوبکر دمامینی نے ''مغنی اللبیب'' کا رد (۳۹) لکھا۔ ابوبکر اپنے وقت میں مصر میں مالکیوں کا قاضی القضاۃ تھا۔ حوادثِ زمانہ سے مجبور ہو کر علی وجہہ سمندر کی راہ اختیار کی، اور تقدیر نے اس کو ہندوستان پہنچایا۔ پہلے سورت میں اترا۔ اس وقت گجرات کا حاکم احمد شاہ تھا۔ گجرات میں ہی بیٹھ کر اس نے ''المنھل الصافی فی شرح الوافی'' (۴۰) لکھی۔ بعد میں دکن چلا گیا اور گلبرگ میں وفات کی اور وہاں ہی مدفون ہے۔ عروض وقوافی میں اس کی دنیا میں مشہور کتاب (۴۱) ہے اور مصر میں چھپ چکی ہے۔ دمامینی کا تذکرہ ''الدر الکامنۃ'' فظ ابن حجر عسقلانی کی کتاب میں مل جاتا ہے۔

امام صاغانی لاہوری اعلیٰ ترین پایے کا لغوی تھا۔ مؤلف لسان العرب (۴۲) اس کا ہم عصر تھا، لیکن ''لسان العرب'' کا مؤلف کوئی اعلیٰ لغوی نہیں تھا۔ اس نے صرف چار کتابیں جمع کر دی ہیں (۴۳)۔ کتاب غلطیوں سے بھری ہوئی ہے۔ استاذ نے فرمایا کہ ''لسان العرب'' کی تنقید پر کام کی ضرورت ہے۔ لیکن فارغ البالی ہو، دو اچھے خاصے عربی داں مدد کے لیے ہوں، تا کہ غیر ضروری کام حسب اشارت کرتے رہیں۔ اور امام صاغانی کی جملہ تصنیفات نیز سامنے ہوں۔ استاذ نے فرمایا کہ میں نے جو کچھ لسان کے حواشی سے متعلق کام کیا، وہ اطمینان سے نہیں

کیا اور صرف احباب کے اصرار پر بغیر دلچسپی اور تعجیلا کیا ہے۔ استاذ نے فرمایا کہ اگر ''لسان'' میں وارد اشعار کے معنی، اور ان کی از روئے شواہد حیثیت وغیرہ چیزوں کو لیا جائے، تو مصنف کی ہر ایک جلد سے ہزاروں غلطیاں نکالی جائیں۔ فرمایا کہ میں نے ''لسان'' کے مطالعے سے اندازہ لگایا ہے کہ اگر اشعار کی غلطیاں لی جائیں، تو کم از کم ایک ہزار غلطیاں فی جلد کے حساب سے ،بیس ہزار غلطیاں ضرور نکالی جائیں (۴۴)۔

امام صاغانی نے پہلے ۸ جلدوں میں صحاح کا تکملہ لکھا۔ ''مجمع البحرین'' لغت میں لکھی اور دونوں کو ملا کر ''العباب الذاخر والحباب الفاخر'' اعلیٰ ترین لغت کی تصنیف پیدا کردی۔ ''العباب'' میں نے انہوں نے الفاظ (آخری حروف کے اعتبار سے) الف سے شروع کر کے میم کے لفظ ''بکم'' تک پہنچائے تو انہوں نے وفات کی (۴۵)۔

استاذ نے اشعار پڑھے جن میں شاعر نے اس لفظ ''بکم'' کو لے کر کہا کہ اتنا بڑا امام بھی بکم پر آ کے خاموش رہ گیا (۴۶)۔

فرمایا کہ آٹھویں صدی میں مجد الدین فیروز آبادی (۴۷) نے ''القاموس'' (۴۸) میں صاغانی کی کتابوں پر ڈاکہ ڈالا۔ فرمایا: صاغانی نے مسلم و بخاری کی متفقہ حدیثیں۔ ''مشارق الانوار'' میں جمع کر دیں۔ مولوی خرمی (خرم علی بلہوری) نے ''مشارق الانوار'' کا اردو ترجمہ کیا۔

فرمایا کہ بغداد جانے کے بعد صاغانی مصر گیا اور بعد میں مکہ شریف میں سکونت اختیار کی اور خود کو ''الملتجی الی حرم اللہ'' لکھتے ہیں، لیکن کتابوں سے معلوم ہوتا ہے کہ خانہ کعبہ میں رہنے کے باوجود وہ یقیناً پھر ایک دو مرتبہ ہندوستان آئے۔

۳ دسمبر ۱۹۴۲ء

آج استاذ نے بتایا کہ: لوگ کیسے مروّت سے خالی ہیں کہ دوسروں کے مایۂ علم پر ہاتھ صاف کرتے ہیں، پھر بھی اس کا تذکرہ یا شکریہ نہیں کرتے، بلکہ الٹا اگلے کو رنج پہنچاتے ہیں!! فرمایا کہ مولوی سید سلیمان الندوی نے مجھ سے صقلیہ کی عربی تاریخ لی اور چھے برس کے بعد واپس کی اور کہا کہ ہم نے اسی کتاب کی بنا پر تاریخ صقلیہ اردو میں کھڑی کردی ہے۔ یہ تاریخ جو ریاست

علی ندوی نے اردو میں شایع کی ہے، آج لائبریری میں میری نظر سے گذری۔ جس میں صاف ظاہر ہے کہ انہوں نے مقدمۂ کتاب ''بشار بن برد''، ابن رشیق اور النتف'' سے استفادہ کیا ہے، پھر بھی میمن صاحب کا ذکر نہیں کیا اور ان جملہ تحریروں کو اپنے رنگ میں ادا کیا ہے، گویا کہ وہ اپنی طرف سے معلومات پیش کر رہے ہیں۔ نہ صرف اتنا، بلکہ وہ ''معارف'' میں نکلی ہوئی بحث کا حوالہ دیتے ہیں! حالانکہ اس میں انہوں نے معافی مانگ کر میرا آخری مضمون بھی شائع نہیں کیا۔ بعد میں استاذ نے یہ تاریخ صقلیہ منگوا کر، ان صفحات کی طرف توجہ دلائی، اور ورق گردانی میں دیکھا گیا کہ کتاب از روئے محققین غلطیوں سے بھری ہوئی ہے۔ اور استاذ نے فرمایا کہ جن کے علم کا مبلغ یہ ہے، ان کے ساتھ بحث کرنا یا ان کے اوپر کچھ لکھنا، میرے شایان شان نہیں۔ ڈاکٹر محمد یوسف نے کتاب کو دیکھ کے فرمایا کہ یہ صاحب (یعنی صاحب کتاب) مؤلف ہیں، لیکن محقق نہیں اور نہ محقق ہونے کے لائق ہیں۔

(الف) آج استاذ نے حسب ذیل علماء کا ذکر کیا جو کہ ہندوستان آئے تھے۔

۱۔ دھلی (دھلوی) ''ذیل تذکرۃ الحفاظ'' بشرطیکہ یہ ذیلی کی تصحیف نہ ہو۔

۲۔ نزیل الہند، تہذیب التہذیب ص ۱۶۱ ج ۱

۳۔ حدیث، تہذیب التہذیب ص: ۲۳۳، ج: ۲۔

(ب) استاذ نے فرمایا کہ عربی کے الفاظ حرمی صُھلی (کذا) عسل (بن ذکوان) ایسے ہی پڑھے جاتے ہیں۔

آج ''کتاب الافعال'' لابن القطاع (۴۹) کا ذکر آیا، جو دائرۃ المعارف میں چھپی ہے۔ استاذ نے فرمایا کہ ملا مراد کے کتب خانہ کا نسخہ لیا گیا ہے، جو ابن القطاع کے اصلی نسخے کی نقل ہے، اصلی نسخہ نہیں لیا گیا۔ فرمایا کہ میں نے اصلی نسخہ دیکھا ہے۔ فرمایا کہ اس کتاب پر دائرۃ المعارف نے بہت پیسہ خرچ کیا ہے، لیکن پھر بھی ضرورت پوری نہیں ہوئی۔ حقیقت میں اگر کتاب الافعال چھپوانے کی ضرورت تھی، تو ''السرقسطی'' (۵۰) کی ''کتاب الأفعال'' چھپوائی جائے، جو سب سے آخر ہے۔ یعنی افعال میں جملہ معلومات کو جمع کر لیا ہے، یا مکمل تر ہے۔ اور

اس میں چھ ہزار افعال ہیں۔ فرمایا کہ السرقسطی کی ''کتاب الأ فعال'' کے دو نسخے ہیں، جو میں نے دیکھے ہیں۔ بس افعال پر یہ تین کتابیں ''ابن القوطیہ'' (۵۱) ''ابن القطاع'' اور ''السرقسطی کی معتبر ہیں، اور ان سب میں السرقسطی کی (کتاب) اس فن میں مکمل ہے، جس کے بغیر اہل علم کی ضرورت ہرگز پوری نہیں ہوسکتی۔

افعال یا مصادر پر ایران میں بھی کتابیں لکھی گئیں، پانچویں چھٹی صدی میں لکھی گئی دو کتابیں قابل ذکر ہیں ''مصادر زوزنی'' (۵۲) اور ''مصادر بیہقی'' (۵۳) جو چھپ چکی ہے۔ یہ مکمل ترین ہے اور اس میں چھ ہزار افعال ہیں۔

۱۱ جنوری ۱۹۴۳ء

مولوی عبدالعلیم صدیقی صاحب میرٹھی نے سلسلۂ اسناد سے متعلق ایک تحریر عربی میں حال میں شایع کی ہے، جس کی کاپی میں نے استاذ کو مطالعے کے لیے دی تھی۔ آج اس کے متعلق بات نکلی۔ استاذ نے فرمایا کہ مولوی صاحب موصوف کی یہ تحریر اپنی جگہ پر کارآمد ہے۔ لیکن ایک عجیب وغریب چیز میں نے ان کے سلسلۂ اسناد میں پائی، یعنی کہ عبدالعزیز الحبشی کی عمر از روئے سلسلۂ اسناد مذکور، گویا ۶۵۰ برس کے قریب پہنچتی ہے، جو ناممکن ہے اور اس سلسلے کی خامی پر شاہد

فرمایا کہ ہمارے نزدیک اسناد کی صحت یا وقعت تیسری صدی ہجری تک ہی بالکل قابل وثوق واعتبار رہتی ہے۔ اور زیادہ ہی زیادہ رعایت کے ساتھ تو دوسرے درجے میں چوتھی صدی تک۔ اس کے بعد سلسلۂ اسناد میں بڑی خامیاں پیدا ہوگئیں اور اس کی صحت کے متعلق کچھ اعتبار نہیں کیا جاسکتا۔ فرمایا کہ یہ کافی ہے کہ بخاری ومسلم نے جس سلسلے سے حدیثیں نقل کی ہیں، وہ بالکل صحیح ہیں، مگر بعد کے علماء حدیث نے اس پر اکتفا نہیں کی، بلکہ ہر حدیث کو خود سے لے کر مسلم تک اور مسلم سے لے کر نبی صلی اللہ علیہ وسلم تک اسناد بیان کرنے کی زحمت اٹھائی ہے۔ اس لیے بہت غلطیاں ہوگئی ہیں۔

فرمایا کہ بہرحال یہ اسناد کا سلسلہ فائدے سے خالی نہیں تھا، اور اس لیے راویان حدیث بہت کچھ نقل حرکت کرتے تھے، اور کم از کم نسبتوں سے روایت جمع کرتے تھے۔

فرمایا کہ بعد میں حدیث کے علم کا مرکز مکہ رہا۔ اس میں روایت کے دو سلسلے ہوتے تھے۔ ایک سلسلۂ مشارقہ (علماء سند وغیرہ) کا، جیسے کہ محمد عابد السندی (۵۴) اور دوسرا سلسلہ مغاربہ (مغربی علماء) کا جیسے فلانی (۵۵) وغیرہ

۲۶ جنوری ۱۹۴۳ء

آج استاذ کے اعزاز میں طلبۂ پنجم و ششم کلاس کی طرف سے چائے پارٹی دی گئی، جس میں ان کی تقرری بر منصب پروفیسر مسلم یونیورسٹی پر جذبۂ خوشی و محبت کا اظہار کیا گیا۔ استاذ نے اپنی جوابی تقریر میں حسب ذیل ارشادات ہمارے استفادے کے لیے بیان فرمائے

۱۔ فرمایا کہ میں نے اپنی پچھلی ۲۹ سال کی زندگی میں کبھی کام کرنے سے گریز نہیں کیا، جس حالت میں رہا خواہ تنخواہ تھوڑی تھی یا زیادہ، تصنیف کا کام لگاتار اسی محنت سے کرتا رہا۔

۲۔ فرمایا کہ علمی سلسلے کے آدمی میں ظاہری تکلفات کی کمی لازمی ہے۔ اگر وہ اپنی ظاہری حالت لباس، فیشن اور ہر جگہ آنے جانے اور ٹانگ اڑانے کی کوشش کرے گا، تو چاہے اور کتنی ہی شہرت اس کو حاصل ہو جائے، لیکن اس کو ''علم'' نہیں مل سکتا۔

۳۔ فرمایا کہ میں نے کبھی خود کو عالم نہیں سمجھا۔ اگر میں خود کو عالم سمجھتا تو یقیناً مجھ میں کام کرنے کی صلاحیت ختم ہو جاتی۔ اور یہ ظاہر ہے کہ چاہے کوئی شخص کتنا ہی باخبر ہو، لیکن لازمی ہے کہ اس کی معروفات کے مقابلے میں اس کی مجہولات زیادہ ہوں گی، تو بس اگر یہ حال ہے تو ہمیں کوئی حق نہیں کہ خود کو ''عالم'' تصور کر کے اپنی جستجو کو ختم کر لیں۔

۴۔ فرمایا کہ یہ البتہ ہے کہ میں نے یہ کبھی نہیں مانا کہ کوئی خاص انسان مثلاً ایک گورے چمڑے والا علم میں زیادہ فضیلت حاصل کر سکتا ہے۔ کیونکہ فطرت نے ہر ایک کو کافی دماغ و وسائل دیے ہیں کہ کام کرے۔ فرمایا کہ آپ یہ کبھی مت سوچیں کہ علم عربی میں آپ کسی طرح یورپی مستشرقین سے کم رہ سکتے ہیں، سب محنت کا پھل ہے۔ یورپی مستشرقین علم عربی کو دو تین مقاصد کے لیے پڑھتے ہیں۔ ۱۔ اپنے قومی استعمار کے لیے۔ ۲۔ علمی فائدے کے لیے۔ ۳۔ اس

علم میں اپنی یادگار چھوڑنے کے لیے۔ مثلاً مارغیولوث عربی کا عالم تھا، لیکن اس کے ساتھ ساتھ کرسچین مشن کا بڑا لیڈر تھا۔ اسی مشنری کام کی خدمت کے لیے اس نے بڑے ناپاک الزام اسلام پر لگائے، کیونکہ وہ جانتا تھا کہ چاہے یہ الزام جھوٹے ہوں تو کیا، صحیح ہوں تو کیا، لیکن پڑھنے والے میری علمی طاقت کی وجہ سے ضرور اس کو وقعت دیں گے۔ فرمایا کہ اس نے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے متعلق لکھا ہے کہ نبوت سے پہلے وہ ''لات'' کی پرستش کیا کرتا تھا اور ثبوت کے لیے امام احمد بن حنبل کی مسند سے حدیث پیش کی ہے۔ اب ظاہر ہے کہ ایک عام شخص کے لیے ایسی دلیل کتنی ہیبت ناک ہوگی۔ لیکن اہل علم جانتے ہیں کہ جب خدیجہ رضی اللہ عنہا نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے سامنے بت پیش کر کے کہا کہ ہم حسب روایت پہلے اس کی پوجا کرتے ہیں، تو نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے اس وہم کو رد کر دیا اور انکار کر دیا اور کہا کہ میں ان کو نہیں پوجوں گا، اب مارغیولوث اس انکار کو اقرار بنانا چاہتے ہیں۔

۵۔ فرمایا کہ انسان کو چاہیے کہ کام کرتا رہے۔ آپ کو چاہیے کہ علم کے لیے خود کو وقف کر دیں اور اس خیال کو بھی اپنے اندر نہ آنے دیں کہ آپ کو بڑی تنخواہ ملے یا آپ اونچے ہو جائیں یا لذیز طعام کھائیں۔ رزق اللہ پر ہے۔ ہر حالت میں کام کرتے جائیں۔ فرمایا کہ میں نے لاہور میں پہلی مرتبہ اپنے بیوی بچوں کو ساتھ رکھا، لیکن میری بیوی اور بچے میرے کام میں مانع تھے۔ زیادہ دیر تک نہ رہ سکے، اس وقت چھ مہینے کے عرصے میں ابوالعلاء پر پوری کتاب لکھ ڈالی اور اس کے علاوہ ابوالعلاء کی تصانیف پر کام کیا اور ساتھ اپنے کالج کی ڈیوٹی اور گھر کا کام سنبھالتا رہا۔

نوٹ: استاذ کی پوری تقریر مجموعہ فوائد تھی۔ میں نے اوپر چند اشارات قلم بند کرنے کی کوشش کی ہے۔

۲۸ جنوری ۱۹۴۳ء

آج شام کی سیر کے وقت استاذ نے اپنے سفر کے حالات پر تبصرہ کیا۔ فرمایا کہ میں نے ایا صوفیہ میں ''التذکرۃ السعدیہ'' میں سے پانچ بیت کعب بن زہیر کے نقل کیے۔ جو دیوان وغیرہ

میں کہیں نہیں ملتے۔ فرمایا کہ یہ ایک واحد کتاب ہے جس میں حماسہ ابو ہلال عسکری (۵۶) اور حماسہ ابن فارس (۵۷) کے حوالجات ملتے ہیں۔ حماسہ بصریہ (۵۸) الملک الناصر صاحب حلب کے لیے لکھا گیا۔ ابوتمام (۵۹) کا ایک اور حماسہ ہے۔ الحماسہ الصغری المعروف بہ ..... (۶۰)۔ آج سے ۵ سال پہلے دار المعارف مصر میں چھپ چکا ہے۔

<u>۲۹ جنوری ۱۹۴۳ء</u>

آج استاذ علم عروض کی تصنیفات کے متعلق کچھ بتا رہے تھے تو سلسلہ علماء ہند تک جا پہنچا۔ (اشارات اجمالاً قلم بند کیے جاتے ہیں۔ نبی بخش)

فرمایا: ابوالفضل العروضی چھٹی صدی ہجری کے عالم تھے اور راضی باللہ کے استاذ تھے۔

فرمایا کہ اس فن پر قدیم تصانیف میں سے:

۱۔ ابن القطاع الصقلی (۶۱) کی کتاب (۶۲)

۲۔ ابن جنی (۶۳) کی کتاب

۳۔ ابن حاجب کا قصیدہ لامیہ (۶۴)

۴۔ اور اسنوی (۶۵) کی شرح قصیدہ لامیہ پائی جاتی ہیں۔ قصیدہ اور شرح دونوں رامپور لائبریری میں محفوظ ہیں۔

مطبوعہ کتب میں سے دمامینی کی کتاب شرح قصیدہ خزرجیہ (۶۶) نفیس ہے اور دوسرے درجے میں دمنھوری کی شرح الکافی فی العروض والقوافی المعروف بالحاشیۃ الکبری

علماء ہند میں سے مفتی سعد اللہ مراد آبادی (م ۱۸۷۷ء) اس فن کے ماہر ترین انسان تھے۔ بلکہ آج سے ۷۵ سال پہلے ہندوستان میں مفتی سعد اللہ کے پایہ کا کوئی عربی کا عالم نہ تھا۔ پہلے وہ امجد علی شاہ والد واجد علی شاہ کی خدمت میں تھے، وہاں انہوں نے ''تاج اللغات'' کی تصنیف میں حصہ لیا۔ اس کے چیف ایڈیٹر مولانا لندنی تھے، مفتی سعد اللہ کی عربی میں ''عروض با قافیہ'' عربی عروض پر ان کی اعلیٰ تصنیف ہے۔ لیکن ان کی معرکۃ الآرا تصنیف اس فن میں فارسی عروض پر ''میزان الاشعار و معیار الافکار'' ہے، جو طوسی کی فارسی شاعری پر تصنیف کی طرح ہے۔

لیکن اس سے بڑھ کر ان کا کارنامہ لغت میں ''قاموس'' پر رد، الموسوم بہ ''القول المانوس فی صفات القاموس'' ہے۔ اس رد کا ایک نسخہ نواب صدیق حسن خاں نے، تیرہویں صدی کے زبردست ادیب احمد آفندی ادیب فارس کو بھیجا تھا اور احمد آفندی نے ایک ہولناک رد'' قاموس'' پر لکھا ہے جس کا نام ''الجاسوس علی القاموس'' ہے، اس میں آفندی نے مفتی سعد اللہ کی کتاب کا ذکر کیا ہے۔ مفتی صاحب کی اس تصنیف کے دو تین نسخے علی گڑھ (یونیورسٹی لائبریری) میں موجود ہین۔ اکثر کتب خانے اسی سے نقل حاصل کرتے ہیں۔

۲۔ ہندوستان کا دوسرا عربی کا بڑا عالم اوحد الدین بلگرامی تھا۔ انہوں نے ''النساء العالمات''، یعنی عالم عورتوں کا تذکرہ لکھا ہے، جو نواب صدر یار جنگ کے کتب خانے میں موجود ہے۔ نیز فاضل مصنف نے ''نفائس اللغات'' اور ''منتخب النفائس'' (۶۷) دو کتابیں لغت پر لکھیں۔ اوحد الدین اردو فارسی اور عربی زبانوں کے ماہر تھے۔ وہ ہندی، اردو کے لفظ کو لے کر اس کا فارسی اور عربی مترادف بتاتے ہیں۔

۳۔ عربی کا بڑا عالم محمد بن احمد یمنی الشیروانی تھا جو باہر سے بلایا گیا تھا اور فورٹ ولیم کلکتہ میں پروفیسر تھا۔ دیوان متنبّی اس نے پہلی مرتبہ ہندوستان میں شایع کی۔

۴۔ مفتی صدر الدین دھلی کے بھی عربی کے بڑے ادیب فاضل تھے۔

۵۔ فرمایا کہ ڈپٹی نذیر احمد میرے استاذ تھے، جن کے استاذ شیخ ابراہیم ذوق تھے۔ اور ڈپٹی نذیر احمد نے مجھے مولوی فضل حق خیر آبادی کے قصیدے کے یہ دو اشعار سنائے۔ ایک یہ

لا تصغين إلى البيض الأماليدى

فأحمر الموت فى أجفانه السود

مولوی فضل حق کے دیوان کا قلمی نسخہ علی گڑھ مسلم یونیورسٹی لائبریری اور کراچی میں حکیم نصیر میاں کے یہاں موجود ہے۔

۶۔ مولوی فضل حق صاحب دھلی کے آخری بادشاہ بہادر شاہ ظفر کے استاذ

تھے۔ انگریزوں نے اس علامہ کو کالے پانی بند کر رکھا تھا۔ ان کے قصائد و رسائل کا مجموعہ میں نے مسلم یونیورسٹی لائبریری سبحان اللہ سیکشن میں دیکھا۔ جہاں مجھے اوپر والا پورا قصیدہ مل گیا۔ مولوی صاحب عربی کے بڑے ماہر تھے۔

۷۔ مفتی عنایت احمد صاحب نے غدر پر ایک عربی میں رسالہ لکھا، جو نواب صدر یار جنگ کے کتب خانے میں محفوظ ہے۔ اور غدر پر انگریزوں کے مظالم پر نیز کافی قصائد لکھے ہیں۔ یہ عالم، نیز مولوی فضل حق صاحب کالے پانی نظر بند کر دیے گئے تھے، وہاں ایک افسر کریم بخش کے لیے فارسی صرف میں اپنے حافظے سے علم الصیغہ (۶۸) کتاب لکھی۔ اردو میں وہاں ''تواریخ حبیب الہٰ'' (۶۹) (سوانح رسول صلی اللہ علیہ وسلم) لکھی اور کالے پانی ہی میں وہاں ''تقویم البلدان'' اور ابوالفداء کی کتاب کا اردو ترجمہ کیا۔ مفتی عنایت احمد، مولانا بدر الدین صاحب کے استاذ مولانا مفتی لطف اللہ صاحب کے استاذ تھے۔ صنعت مہملہ میں کمال حاصل تھا حتیٰ کہ مکالمۃ میں نیز بے تکلف بے نقط عربی الفاظ استعمال کرتے تھے۔ ان کی کتابوں کے نام سے سنہ تصنیف کا پتا چلتا ہے (۷۰)۔ ۱۲۷۷ھ میں رہا ہوئے اور تقریباً ۱۲۷۹ء میں حج کو جا رہے تھے کہ جہاز غرق ہو گیا اور شہادت پائی۔

<u>فروری ۱۹۴۳ء کا پہلا ہفتہ</u>

۱۔ استاذ نے فرمایا کہ علماء ہند تحریر کے خاتمے پر ۱۲ کا ہندسہ لگاتے ہیں، جو ابجد کے حساب سے ''حد'' کے عدد ہیں۔ فرمایا کہ عربی کے قدیم علماء جب نیا مضمون شروع کرتے، یا ایک ہی مضمون میں ایک نئے خیال کا اظہار کرتے ہیں (جب کہ انگریز میں نئی پیراگراف) تو سیاہی یا سرخی سے ''بت'' کا نشان لگاتے ہیں (= کاٹ دینا، یعنی پچھلی عبارت ختم ہو چکی) اور اگر کسی خاص نام وغیرہ کی طرف توجہ دلانا مقصود ہوتا ہے (‾) ایسا ہی نشان لگاتے ہیں، اب اردو وغیرہ میں یہ نشان اکثر عَلَم پر لگایا جاتا ہے۔

۲۔ فرمایا کہ مصنف ''خزانۃ الادب'' (۷۱) کے متعلق اس وقت کے علماء کہتے تھے کہ کاش تم تیسری صدی ہجری میں پیدا ہوئے ہوتے، کیونکہ وہ عربی کے بڑے عالم تھے، لیکن

میں کہتا ہوں کہ وہ بیسویں صدی میں ہوتے۔ کیونکہ ان کی ریسرچ کا وہی طریقہ ہے جس کو علماء یورپ نے اختیار کیا ہے۔

۳۔ آج استاذ نے عربی سوسائٹی کے جلسے میں جہاں طلبہ نے اپنے مضامین پڑھے صدارت فرمائی اور آخر میں مختلف مضامین کی اصلاح دیتے ہوئے فرمایا کہ

''گو بدیع الزمان ہمذانی (۷۲) فن مقامات (۷۳) کی تکمیل کی رو سے اس کے موجد تھے، لیکن مقامہ لکھنے میں وہ سب سے اول نہیں تھے، کیونکہ ان کے استادوں کے استاذوں میں سے ابو بکر ابن درید (۷۴) نے ''مجالس'' لکھیں، جو اسی فن کا پیش خیمہ ہیں۔ فرمایا کہ میں اس کتاب کو ممالک اسلام سے اپنے ساتھ لایا ہوں۔ فرمایا کہ اس کے بعد استاذ بدیع الزمان چوتھی صدی کے عالم تھے۔ نیز ابن فارسی اللغوی نے اس رنگ کی کتاب لکھی بہ نام ''فتیا فقیہ العرب'' جس کو ہمارے دوست ڈاکٹر علی محفوظ (بغداد) نے مجلۃ المجمع العلمی (دمشق) میں اب چھاپ دیا ہے۔

۴۔ فرمایا کہ یورپ والوں کی تنقید میں بہت سی خامیاں ہیں، جس سے ہمیں بچ کر رہنا چاہیے۔ مثلاً: ان کا یہ کہنا کہ: ''مقامات حریری'' کا درجہ بعد از قرآن ہے۔ یہ حماقت ہے اور خود قرآن پاک کی توہین ہے۔ فرمایا کہ حریری سے ہمذانی کی قابلیت ہزار بار برتر ہے، کیونکہ اس نے تو چلتے چلتے مقامات املاء کرا دیے، لیکن حریری نے تو اپنی حیات کے پچاس سال اپنے مقامات پر صرف کیے۔ اگر اور علماء نیز دردسری کرتے تو یقیناً ایسے یا اس کے لگ بھگ مقامات تیار کر سکتے تھے۔

فرمایا کہ ہم حدیث نبوی کی بے مثال فصاحت و بلاغت سے کبھی حریری کے مقامات کو پہلے نہیں رکھ سکتے۔ مضامین نگاروں کو ہدات دیتے ہوئے فرمایا کہ

۱۔ جو کچھ لکھو وہ اپنی محنت سے لکھو۔ نقالی سے قابلیت ہرگز نہیں بڑھے گی۔

۲۔ کبھی حکم تام نہ لگاؤ، حکم تام لگانے کی شرط یہ ہے کہ جس پر ایسا حکم لگانا مقصود ہو اس کا مطالعہ مکمل کیا جائے اور اس کی تفتیش استقصائی ہو۔ ورنہ آئندہ چل کر دنیا ایسے حکم

کو رد کر دے گی اور اس نظریہ یا تصنیف کی قیمت بالکل گر جائے گی۔

۲ فروری ۱۹۴۳ء

استاذ نے آج ابن الفارس اللغوی کے متعلق نہایت مفید معلومات دیئے

فرمایا کہ ابن الفارس، ابن درید کے تھوڑے بعد کے ایک مصنف اور خدا پرست عالم تھے۔ ان کا ترجمہ ''طبقات القراء''، باخرزی کے ''دمیۃ القصر'' (۷۵)، ''معجم الادباء'' وغیرہ میں ملتا ہے۔

ان کی تصانیف میں سے ''مقاییس اللغۃ'' (۷۶) ایک بڑی بے نظیر کتاب لغت پر ہے۔ ابن الفارس نے ''الصاحبی فی فقۃ اللغۃ'' میں لغت کے اصول وقواعد سے بحث کی ہے اور ''مقاییس اللغۃ'' میں علم لغت پر گویا مبسوط تبصرہ کر دیا ہے اور تاریخ بنا دی ہے۔ فرمایا کہ'' الصاحبی'' کے بعد'' مقاییس اللغۃ'' کی وہی منزل ہے، جو'' تاریخ ابن خلدون'' کی اس کے مقدمے کے بعد۔ یعنی کہ مقدمے میں فلسفہ تاریخ ہے اور اس کے بعد تاریخ۔ ویسے ہی فقۃ اللغۃ میں فلسفہ لغت ہے اور بعد میں لغۃ پر تصنیف وتفصیل

فرمایا کہ ابن فارس کے استاذ ابن القطان (۷۷) نے ثعلب (۷۸) سے پڑھا ہے۔ ابو عمر زاہد المطرز (۷۹) ان کے (ابن القطان کے) کلاس فیلو تھے۔ المطرز نے ثعلب کی ''فصیح اللغۃ'' پر ''فائت الفصیح'' لکھی اور ابن الفارس نے'' تمام الفصیح'' (۸۰)۔ فرمایا کہ'' مجمل اللغات'' (۸۱) (معاجم میں سے) ابن الفارس کی اچھی خاصی تصنیف ہے۔ فرمایا کہ اس کا ابتدائی حصہ، ایک چوتھائی حصہ لڑائی سے پہلے مصر میں چھپ گیا تھا (۸۲)۔ ایک قدیم نسخے کے درمیانی حصہ جو تقریباً نصف ہوگا، استاذ کے پاس موجود ہے۔ باقی مجمل کے عام نسخ عموماً کتب خانوں میں پائے جاتے ہیں، جن میں بعض بہت اعلیٰ قدیم العہد لغتیں ہیں۔ پانچویں چھٹی صدی ہجری کے نسخے کثرت سے پائے جاتے ہیں۔

فرمایا کہ ابن الفارس کی ''فتیا فقیہ العرب'' پر حریری نے فقہی مقامہ کھڑا کیا۔

فرمایا کہ'' الصاحبی فی فقہ العرب'' اپنی نوع کی بے نظیر کتاب ہے۔ اس رنگ پر دیگر

تصانیف میں سے ''خصائص'' لابن جنی و ''سر الصناعۃ'' لابن جنی ہیں۔ ثعالبی نے ''فقہ اللغۃ''، ''الصاحبی'' کے زیر اثر لکھی، لیکن ''الصاحبی'' سے مختلف رنگ پر ہے۔ فرمایا کہ ابن فارس پہلے شخص ہیں، جنہوں نے لغت کے اصول و قواعد پر سنجیدگی سے مبسوط بحث کی ہے۔ فرمایا کہ ابن الفارس کی ''کتاب اللامات'' لبزک میں چھپ چکی ہے۔ (اور اس کا رسالہ ''کلا'' (۸۳) خود میمن صاحب نے ایڈٹ کیا ہے) ''فقہ اللغۃ'' (۸۴) کے ذیل میں فرمایا کہ اسماعیل صاحب بن عباد، جو اُن کے شاگرد تھے، ان کے نام سے کتاب کو منسوب کیا۔

۷ نومبر ۱۹۴۳ء

نوٹ: گذشتہ سطور سے لے کر آج تک معلوم نہیں کتنی حکمت کی باتیں استاذ سے سنیں، لیکن ان کو قلم بند نہ کر سکا۔ آج مجملاً جو چیزیں دماغ میں رہ گئی ہیں وہ تحریر کیے دیتا ہوں۔

ایک دن فرمایا کہ علم کو علم کی خاطر پڑھیں۔ جس علمی کوشش میں دنیاوی مقاصد مضمر ہوتے ہیں، وہ علم گندا ہو جاتا ہے۔ فرمایا کہ میں نے علم کسی ذاتی غرض یا مقصد کے لیے کبھی نہیں سیکھا، البتہ علم کے طفیل جو کچھ اللہ پاک نے دیا، اس کو بخوشی قبول کر لیا۔ فرمایا کہ جو لوگ علم کو ذاتی اغراض کے لیے پڑھتے یا استعمال کرتے ہیں، ان کی سب علمی کوششیں خاک میں مل جاتی ہیں اور ان سے کوئی نتیجہ نہیں نکلتا۔

ایک دن فرمایا کہ سیوطی کی تصانیف کی علماء کے نزدیک کچھ زیادہ وقعت نہیں۔ انہوں نے اپنی طرف سے کوئی معلومات پیش نہیں کیے۔ جو کچھ دوسروں کی تصانیف میں ملا، ان کو جمع کر دیا۔ ان کی تصانیف کی قیمت اب اگر ہے تو صرف اس لیے کہ ان کے مأخذ فنا ہو چکے ہیں۔

فرمایا کہ اگر کوئی شخص کسی بھی فن میں گہرا اترے، تو اس کو ماہرین فن کی غلطیاں بھی نظر آ جائیں گی۔ اپنی مثال دی کہ چوں کہ ادب عربی کے گوشے گوشے کو میں ٹٹول چکا ہوں، لہٰذا ایسے بڑے امامِ ادب جیسے کہ مفضل الضبی (۸۵)، ابو علی قالی (۸۶)، ابو عبید بکری (۸۷) وغیرہ کی فروگذاشتیں نیز نظر آ گئیں۔ فرمایا کہ ان غلطیوں سے متنبہ کرنے میں، میں نے کوئی بڑا کارنامہ نہیں کیا۔ ان جیسی غلطیاں میری تصنیفات میں نیز ہوگئی ہوں گی، لیکن ان غلطیوں سے آگاہ

صرف وہی ہوسکتا ہے، جس کی نظر نہایت وسیع ہو اور ادب عربی کی گہرائیوں تک اتر چکا ہو۔

[استاذ ہمیشہ اپنے گھر کی ضروریات خود ہی بازار جا کر پوری کر لیتے ہیں اور سبزی گوشت وغیرہ خود ہی خرید کر کے لاتے ہیں۔ بندہ بھی کئی مرتبہ ان کے ہمراہ شہر جا چکا ہے۔ شہر کی لین دین میں بھی استاد کا تجربہ وفہم دیکھ کر میں حیران رہ گیا۔ اسی سلسلے میں کئی مرتبہ فرمایا]

یہاں کئی لوگ اپنی جنٹلمینی کا شکار ہو گئے ہیں۔ میں اگر ان کی طرح رہوں اور نوکروں کے ہاتھ بازار کی سڑیل چیزیں منگوا کر کھاتا رہوں، تو میری صحت چند دنوں میں تباہ ہو جائے گی، اور میں کسی کام کا نہ رہوں گا۔ باقی رہی لوگوں کی میری طرف انگشت نمائی، اس کی مجھے کوئی پرواہ نہیں۔ کفارِ مکہ نیز نبی صلی اللہ علیہ وسلم پر یہی اعتراض کیا کرتے تھے کہ یہ نبی کیسے ہیں جو بازار میں خرید وفروخت کرر ہے ہیں۔ (**مالهذا الرسول ياكل الطعام ويمشى فى الاسواق**) لہٰذا میں تو نبی کی سنت ادا کرر ہا ہوں، اور دیگر کہ میں علی گڑھ والوں کی تعریف خواہ مذمت سے آگے نکل چکا ہوں۔ [استاذ یہاں کے اکثر لوگوں کے برتاؤ سے نہایت شاکی ہیں]

فرمایا کہ یہاں خلوص سچائی کے بدلے مکاری وغداری بھری ہوئی ہے۔ کہا کہ یہ خطہ کسی تمدن کا مرکز تھوڑے عرصے کے لیے رہا ہے، لیکن بگڑے ہوئے تمدن کا۔ اب یہاں غلامانہ ذہنیت نے خوب کام کیا ہے اور لوگوں کے اخلاق کو کلیۃً تباہ و برباد کر دیا ہے۔

فرمایا کہ علی گڑھ سے میں اتنا تنگ آیا ہوا ہوں کہ اگر دوسری کسی جگہ معقول روزگار بن جائے، تو یہاں کی پروفیسر شپ اور تنخواہ کو نظر انداز کر کے چلا جاؤں۔

فرمایا کہ مسلم یونیورسٹی میں سے علم کی قدر جاتی رہی۔ آئندہ یہاں وہی لوگ اسٹاف میں آتے رہیں گے، جو یہاں کسی ریاست کے سلسلے میں کارآمد ہوں گے، نتیجہ یہ نکلے گا کہ باہر سے قابل اور فاضل لوگوں کا آنا بند ہو جائے گا اور یہ یونیورسٹی کسی کام کی نہ رہے گی۔ فرمایا کہ عربک ڈپارٹمنٹ میں جان اس وقت تک ہے، جب تک میں یہاں ہوں، اس کے بعد امید نہیں کہ یہاں کوئی اطمینان بخش کام ہو سکے۔

۱۷ نومبر ۱۹۴۳ء

فرمایا کہ ہندوستان کے لوگوں نے پیسے اور تنخواہ کو علم پر مقدم رکھا ہے، وہ انتظامی کام کو محض علمی محنت پر ترجیح دیتے ہیں، لہٰذا اگر کہیں زیادہ تنخواہ مل گئی تو اپنی علمی زندگی کو خیر باد کہہ دیں گے۔ لیکن وہ لوگ یہ نہیں سمجھتے کہ پیسے کے عوض میں وہ زندگی کو بیکار بنا دیتے ہیں۔

فرمایا کہ اخفش نام کے گیارہ شخص ہو گذرے ہیں، لیکن ادب کے لحاظ سے تین قابل ذکر ہیں۔ ابو الخطاب الاخفش الاکبر، جو کہ سیبویہ کے استاذ تھے۔ اگر کتاب سیبویہ میں کہیں ''الاخفش'' کا نام آئے، تو اس سے مراد ابوالخطاب الأخفش، استاذ سیبویہ ہے۔ بعد کے علماء نے اگر کہیں الاخفش کا تذکرہ کیا ہو، تو اس سے مراد سعید بن مسعدۃ الاخفش ہے، جو کہ سیبویہ کا شاگرد ہے، جس کو بعض علماء نے الاخفش الأوسط) اور کبھی الأصغر) لکھا ہے (۸۸)۔ الکامل للمبرد میں جو الاخفش کا نام آیا ہے، وہ ابوالحسن علی بن سلیمان الاخفش ہے، جو المبرد کا شاگرد ہے۔

فرمایا کہ اس مسئلے پر علماء نے بہت کچھ رائے زنی کی ہے کہ: ''ابو ہریرۃ'' میں ''ہریرۃ'' منصرفہ ہے یا غیر منصرفہ۔ فرمایا کہ ہمارے استاذ مولوی عبدالرحمٰن پنجابی مدرسہ حاجی علی جان دھلی، اس کو منصرف پڑھتے تھے اور فرماتے تھے کہ ''ہریرۃ'' تصغیر ہے۔ ''ہرۃ'' کی، جو خود منصرفہ ہے۔ اور رسول کریم ﷺ نے ابو ہریرۃ کو لقب بلی اٹھاتے ہوئے دیکھ کر ہی دیا تھا۔ اور کوئی وجہ نظر نہیں آتی کہ اس کو غیر منصرف پڑھا جائے۔ استاذ نے فرمایا کہ مولوی نظیر احمد صاحب سہسوانی نے نیز اس پر ایک رسالہ لکھا تھا، جس کی ایک کاپی میں نے کتب خانہ خدیویہ میں دیکھی تھی، جس میں نیز مولوی صاحب نے اس کو منصرف ثابت کرنے کی کوشش کی ہے۔

استاذ نے فرمایا کہ میری رائے ان بزرگوں کے خلاف ہے۔ میں یہ مانتا ہوں کہ ''ہریرۃ'' ہرۃ کی تصغیر ہے اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ابو ہریرہ کو بلی آٹھاتے ہوئے دیکھ کر ہی یہ کہہ دیا تھا۔ اور نیز یہ کہ ''ہرۃ'' عربی میں منصرف ہے۔ لیکن ان بزرگوں کے دماغ میں یہ بات نہیں اتری تھی کہ عربی میں ''ہریرۃ'' عورت کا نام بھی ہوتا ہے اور اس اصحابی کی وجہ کنیہ حالانکہ یہ بلی کا واقعہ ہے، لیکن اس کا مفہوم دراصل وہی نام ''ہریرۃ'' عورت کا ہے، جس کی مناسبت اور واقعے کی موافقت سے یہ کنیت دی تھی۔ اور ''ہریرۃ'' علَم اور تانیث کی وجہ سے غیر منصرف ہو جاتا

ہے اور ادب عربی میں پچیسیوں مثالیں موجود ہیں، جہاں ''ہریرۃ''غیر منصرف ہو کر آیا ہے۔ مثال کے طور پر استاذ نے اعشیٰ کے قصیدے کا (جو کہ کبھی معلقہ بھی مانا جاتا ہے) شعر پڑھا، جس میں صرف ''ھریرۃَ''پڑھنے سے ہی شعر کا وزن برابر رہتا ہے اور ''ھریرۃٍ''سے وزن ٹوٹ جاتا ہے۔ مثلاً اعشیٰ کے بیتوں کے یہ ٹکڑے تین مثالیں۔

(۱) وَدِّعْ هُرَيْرَةَ إِنَّ الرَّكْبَ مُرْتَحِلُ (اعشیٰ لامیہ)

(۲) صَدَّتْ هُرَيْرَةُ أَنَّ مَا تَكَلَّمْنَا (اعشیٰ لامیہ)

(۳) هُرَيْرَةُ وَدِّعْهَا وَإِنْ لَامَ لَائِمُ (اعشیٰ میمیہ)

فرمایا کہ المبرد (۸۹) نے سیبویہ پر رد لکھا ہے وہ غیر مقبول ہے۔ لہٰذا ابن ولاد المصری (۹۰) کو المبرد کے رد کا جواب لکھنا پڑا۔

فرمایا: میں نے اپنی زندگی کے سات برس نحو پر ضائع کیے، جس پر مجھے افسوس ہے اور آخر میں، میں نے نحو کو ترک کر دیا اور ادبیات کو لے لیا۔ مگر نحو کا احسان ہے کہ شواہد کی وجہ سے ادب کی طرف رجحان ہوا۔

۱۷ فروری ۱۹۴۴ء

دنیا استاذ کے علم وفضل کی قائل ہو چکی ہے، لہٰذا اس کی وضاحت وتشریح کی ضرورت قطعاً نہیں۔ ہم نے جو استاذ میں ایک خاص بات پائی، وہ یہ کہ ان کو اپنا علم قریب قریب پورا حفظ ہے۔ جملہ محفوظات ان کے صدر میں ہیں اور مبرد کے قول کے مطابق ''العلم ماحوضر بہ''(۹۱) کا اطلاق یقینی استاذ کے علم پر ہوتا ہے۔ استاذ کے محفوظات ومحاضرات کے معجزات ہم نے کئی مرتبہ دیکھے ہیں اور سنے ہیں، چند یہاں دیے جاتے ہیں۔

۱۔ ڈاکٹر عبدالستار الصدیقی پروفیسر الہ آباد یونیورسٹی کو ہم نے اپنی عربک سوسائٹی میں گذشتہ سال بلایا۔ انہوں نے ''سامی زبانوں کے چند خصوصیات''پر لیکچر دیا۔ استاذ صاحب صدر تھے۔ ڈاکٹر ہادی حسن نیز موجود تھے۔ لیکچر کے بعد استاذ نے اپنی تصریحات میں عجیب وغریب معلومات پیش کیں۔ خصوصاً فاضل مقرر کے ایک نکتے پر تبصرہ کرتے ہوئے کہ

فارسی میں ''ذ'' نہیں ہوتا، لہٰذا ''د'' سے اس کی تعبیر ہوتی ہے۔ استاذ نے اشعار در اشعار فارسی زبان کے پیش کیے، جن میں ''ذال'' موجود تھا۔ غالباً انوری کے اشعار تھے۔

آناں کہ بفارسی سخن می رانند
در موقع دال ذال را بنشانند
ما قبل وی ار ساکنی جز دای بود
دال است و گرنہ ذال معجم خوانند
دستت بہ سخا چوں ید بیضاء بنموذ
از جودش تو در جہاں جہانی افزوذ

میں دیکھ رہا تھا کہ ڈاکٹر ہادی حسن، استاذ کی طرف اس وقت نہایت تعجب سے دیکھ رہے تھے۔

۲۔ استاذ سے سنا ہے کہ ''مجلس مصنفین'' کے ایک جلسے میں مولانا طفیل احمد نے ''بابل قدیم'' پر مضمون پڑھا۔ نواب صدر یار جنگ ''صدر'' تھے۔ جلسہ حلیم صاحب کی کوٹھی پر ہوا۔ بابل کے صحیح تلفظ پر مضمون نگار نے کچھ لکھا تھا اور پڑھتے وقت حاضرین سے نیز رائیں لی گئیں۔ جناب صدر نیز ان کو ''بابُل'' بتانے لگے۔ شاید حلیم صاحب نے میمن صاحب کی رائے طلب کی۔ استاذ صاحب نے کہا کہ میں حیران ہوں کہ بعد کی کتب میں سے حوالے دیے جا رہے ہیں اور آپ مسلمان علماء ہیں۔ آپ کو تو معلوم ہونا چاہیے کہ یہ لفظ قرآن پاک میں آیا ہے ''بِبَابِلَ هَارُوْتَ وَمَارُوْتَ'' اور اس صریح ضبط کے بعد بحث کی کوئی گنجائش نہیں۔ استاذ کے اس محاضرے پر سب حیران ہوئے۔ بعد میں صدر صاحب مضمون ختم ہونے سے پیشتر چلے گئے اور استاذ کو صدارت دی گئی۔ مضمون ختم ہونے پر استاذ نے اپنی محفوظات سے ''بابل'' اور اس کی حکومت و حکام کے متعلق وہ معلومات پیش کیے، کہ حاضرین حیران رہ گئے۔ پروفیسر شریف صاحب نے تو استاذ کو اتنا بھی کہہ دیا کہ میمن صاحب! آپ کے مقابلے میں ہم خود کو جاہل پاتے ہیں۔

۳۔ دسمبر ۲۸۔۲۹۔۳۰۔۳۱ سنہ ۱۹۴۴ء کو بنارس میں اورینٹل کانفرنس تھی۔ ہم استاذ کے ساتھ اس میں شریک ہوئے۔ عربی و فارسی سیکشن کی میٹنگ میں مولانا ظفر احمد عثمانی، مولانا اشرف علی تھانوی کے قریبی رشتے دار نے، جو کہ ڈھاکہ یونیورسٹی میں حدیث کے استاذ ہیں، اپنا مقالہ ''ہندوستان میں حدیث کی حفاظت'' پر پڑھا۔ استاذ صاحب بیٹھے تھے اور اخیر میں مشافہۃ مولانا کے مضمون پر تبصرہ کیا اور جن کتابوں کے مولوی صاحب نے حوالے دیے تھے، خود انہیں کتابوں میں سے اپنی حفظ سے اقتباسات پیش کیے اور اس کے علاوہ کئی دیگر معلومات پیش کیں، جن کو سن کر حاضریں حیران رہ گئے۔ ہم نے اس دن دیکھ لیا کہ اسلامیات کے متعلق استاذ کو زندہ انسائیکلو پیڈیا کہا جائے تو بھی ان کے مبلغ علم سے کم ہے۔

۴۔ ڈاکٹر رفیق احمد خاں سے سنا اور بعد میں خود استاذ صاحب سے دریافت کرنے پر بھی معلوم ہوا کہ ابھی ابھی مجلس مصنفین میں لکھنو کے ایک فاضل نے ''خطاطی'' پر مضمون پڑھا۔ سامعین پر اتنا اثر ہوا کہ مضمون نگار کے ہاتھ چومنے لگے، گویا انہوں نے کوئی معجزہ کر کے دکھایا۔ استاذ کو جلسے کے وقت صدر بنایا گیا اور بعد میں سکریٹری صاحب ان کو لکھتے رہے کہ آپ اس مضمون پر ضرور کچھ کہیے تا کہ علی گڑھ کی لاج رہے۔ استاذ نے فرمایا کہ وہ اس موقع پر ''علی گڑھ کی لاج'' کی فکر میں پڑ گئے، لیکن انہوں نے پیشتر صرف یہ اطلاع بھی نہ دی کہ مجھے صدارت کرنی ہے۔ بہر حال مضمون ختم ہونے پر استاذ صاحب اٹھے اور پہلے ہی حاضرین کے سامنے عماد الدین کاتب کی (۹۲)، کتاب پیش کی جہاں سے مضمون نگار نے معلومات حاصل کیے تھے۔

اس کے بعد استاذ نے ''خطاطی'' پر وہ تصریحات بیان کیے کہ بقول ڈاکٹر رفیق احمد خاں ''ہم سب مرعوب ہو گئے۔'' استاذ نے بعض نکات پر تو مضمون نگار کی اصلاح بھی کر دی کہ ''ابن مقلہ'' (۹۳) کو خط نسخ کا موجد نہیں کہا جا سکتا، کیونکہ اس کے پیدا ہونے سے بھی پہلے کی کتابیں خط نسخ میں موجود ہیں، البتہ وہ اس خط کے مزین، محسن اور سب ہی کچھ تھے اور اس خط کو انہوں نے ہی کمالیت پر پہنچایا، لیکن موجد نہیں۔ دوم کہ مضمون نگار شیعہ ہونے کی وجہ سے عمر خیام کو ''عمرو خیام'' پڑھ رہے تھے۔ استاذ نے نہایت اچھے طریقے سے واضح کر دیا کہ ''تیس برس پہلے

میں نے مولانا شبلی کی ایک کتاب غالباً ''شعرالعجم'' میں ''عمرؔ'' دیکھا تھا لیکن اپنی کم علمی اور مولانا شبلی کی تصنیف کی وجہ سے میں نے اس لفظ کو یونہی رہنے دیا۔ لیکن اس کے بعد آج تیس برس کے مطالعے میں، میں نے ''عمرو خیام'' نہ کہیں دیکھا نہ سنا۔ اور آج ہی پہلے موقع پر کہ میں اس لفظ کو پھر ''عمرو خیام'' سن رہا ہوں۔ خود عمر خیام کا اپنا مصرع ہے۔

هم عمر خیامی هم عمر خطاب

اس کے بعد شک کی کیا گنجائش؟

استاذ کی ان تصریحات نے سب حاضرین میں ہیجان پیدا کر دیا، اور اب تک علی گڑھ میں استاذ کی اس فاضلانہ تقریر کا چرچا باقی ہے۔

<u>۱۷ فروری ۱۹۴۴ء</u>

آج استاذ نے اپنے بچے عمر کا ختنہ کرایا۔ خون بند نہ ہونے کی وجہ سے نہایت پریشان رہے۔ شام کو میں اور ڈاکٹر یوسف استاذ صاحب کی معیت میں نقوی پارک کی سیر کو گئے۔ ہندوستان کے علماء ذکر آیا۔ استاذ صاحب نے فرمایا کہ ہندوستان میں بے شک چند ایسی ہستیاں بھی پیدا ہوئیں، جن کو عربی پر عبور تھا، لیکن اکثر علماء عربی کے کما حقہ ماہر نہ تھے۔ ان کا رجحان فارسی کی طرف رہا۔ پھر کہا کہ لیکن چند علماء عربی کے سلسلے میں قابل ذکر ہیں۔

۱۔ اوحدالدین بلگرامی۔ اس کی نفائس اللغات (جس میں اردو الفاظ کے معنی اور پھر فارسی اور عربی کے مترادفات دیے ہیں) اور عربی عورت شاعروں کا تذکرہ (عربی) سے واضح ہے کہ وہ عربی کے بڑے ادیب تھے۔ (استاذ شاگرد تھے مولانا شیر احمد سہسوانی کے (وفات ۱۳۲۶ھ) اور وہ شاگرد اوحدالدین بلگرامی کے)

۲۔ مولانا عنایت احمد صاحب، جنہوں نے غدر پر عربی میں رسالہ لکھا، جو نواب صدر یار جنگ کے کتب خانے میں محفوظ ہے۔ ان کے مطالعے سے معلوم ہوتا ہے کہ نہایت فاضل تھے۔ ''علم الصیغہ'' ان کی کتاب مشہور ہے۔

۳۔ مولانا فضل حق صاحب خیر آبادی نیز قابل قدر علماء عربی میں سے ہیں۔

عربی میں اچھے قصائد لکھے ہیں، لیکن ''تجنیس'' کی بھرمار کی وجہ سے ان کی قیمت کو کچھ کم ہی کر دیا ہے۔

۴۔ ڈپٹی نذیر احمد صاحب کے ادبی معلومات اتنے وسیع نہ تھے، لیکن ان میں ایک خوبی تھی کہ جو کتابیں انہوں نے پڑھی تھیں، مثلاً مقامات حریری، حماسہ، متنبّی وغیرہ ان کے مصنف کے لگ بھگ اور اسی اسلوب میں وہ خود تحریر کر سکتے تھے۔ محض حماسہ اور متنبّی پڑھ کر بھی وہ اتنے اچھے اشعار کہہ سکتے تھے۔

۵۔ مصنف نفحۃ الیمن احمد بن محمد شروانی الیمنی کو علماء ہند نے جو جوابات دیے تھے، ان میں سے شاہ عبدالعزیز کا جواب بھی ہے، جس سے معلوم ہوتا ہے کہ شاہ عبدالعزیز کو عربی پر اچھا عبور تھا۔

۶۔ مفتی سعد اللہ رامپوری جو علم عروض کے پورے برصغیر میں ماہر ترین عالم تھے وغیرہ وغیرہ۔

۲۵ فروری ۱۹۴۴ء

مجلس مصنفین کے پچھلے اجلاس میں استاذ صاحب نے جو صدارتی تقریر فرمائی تھی، اس کی شہرت کا چرچا ہر جگہ سننے میں آیا۔ لیکن حاسدوں کو صبر نہ آیا۔ سنا گیا کہ کیفی چریا کوٹی صاحب، جو کہ لائبریری میں کام کر رہے ہیں، انہوں نے مضمون نگار حضرت سے ساز باز کر کے استاذ کی تقریر پر ایک تنقیدی نوٹ، شیعہ حضرات کے ایک لکھنوی اخبار میں شائع کرایا۔ یہ نوبت کیوں آئی؟

پچھلے دن لائبریری کمیٹی نے استاذ صاحب کی رائے طلب کی کہ کتابوں کے نام وغیرہ درج کرنے میں اگر ایک آدمی کو لگایا جائے، تو وہ ایک دن میں کتنے نام درج کر سکتا ہے۔ استاذ صاحب نے فرمایا کہ بیس سے تیس تک کتابوں کے نام مع ضروری معلومات کے نوٹ کر سکتا ہے۔ اب اس پر کیفی چریا کوٹی کو بہت غصہ آیا۔ کہ میمن صاحب نے ان کے لیے کام بڑھا دیا اور اب یہ بے دلائل اور بے ہنگم تنقید لکھ کر غصہ جھاڑا۔ شیعہ حضرات تو راضی ہو گئے کہ ان کے بیان کو چھاپ

دیں، کیوں کہ استاذ صاحب نے اس مضمون نگار کے ایک فعل کو مجلس کے سامنے آشکار کر دیا تھا، وہ یہ کہ ''عمر خیام'' کو صرف اپنی آراء کی وجہ سے ''عمرو خیام'' پڑھنے لگے تھے۔

استاذ نے فرمایا کہ ''عمر'' کو ''عمرو'' صرف مولوی شبلی نے شعر العجم میں لکھا اور معلوم نہیں کس بناء پر، باقی دنیا بھر میں کسی کتاب میں ''عمرو خیام'' نہیں لکھا۔ اب کیفی صاحب نے اس سے باتیں بنائیں کہ میمن صاحب نے مولوی شبلی کی تنقیص کی۔ اور اپنے قسطنطنیہ کے سفر کو بیان کر کے اپنی فوقیت دکھانے لگے اور کہا کہ ابن مقلہ خط نسخ کا موجد نہیں تھا وغیرہ۔

آج پھر مجلس مصنفین کی مجلس منعقد ہونے والی تھی۔

یادداشت: کتاب الحلبة (۹۴): (ابن کامل (۹۵) کی) ایوبی خاندان کے لیے لکھی گئی تھی، مصنف کے ہاتھ کا لکھا ہوا نسخہ بانکی پور لائبریری میں موجود ہے۔

۴ مارچ ۱۹۴۴ء

استاذ صاحب نے فرمایا کہ دواوین اشعار عربی صرف ایک تہائی باقی رہ گئے ہیں۔ فرمایا کہ عربی تصانیف میں سے بعض باقی ہیں، لیکن ادباء کو ان کا پتا نہیں مل سکا۔ ایسی کتابیں بمشکل ایک فی صد ہوں گی۔

فرمایا کہ نایاب کتابیں خریدی نہیں جاسکتی۔ کتابیں صرف تجویز و عقل و محنت و جستجو سے مل جاتی ہیں۔

۳۱ مارچ ۱۹۴۴ء

شام کو نقوی پارک ٹہلنے گئے۔ استاذ صاحب سے کتب الخیل (۹۶) کے متعلق دریافت کیا۔ فرمایا کہ اس فن میں بہترین کتاب ابو محمد الاسود الاعرابی (۹۷) کی ہے، جو مصر میں دارالکتب میں موجود ہے اور جس کا کچھ حصہ ''بلوغ الارب'' والے نے نقل کیا ہے۔ فرمایا کہ ''بلوغ الارب'' والے کے متعلق میرا نظریہ کچھ مختلف ہے۔ یہ کتاب چھپی تو دنیا داد دے اٹھی، لیکن میں نے جہاں تک اس کو غور سے دیکھا تو معلوم ہوا کہ مصنف کے پاس نایاب معلومات بالکل کم ہیں۔ اس نے اقرار کیا ہے کہ کتابوں کے نام تبدیل کر کے پڑھنے والوں کو شبہے میں ڈال دیا ہے۔ جو کچھ تھوڑی

سی معلومات اس کے پاس ہیں، ان کے مقابلے میں اب شاید ہمارے پاس کئی گنا زیادہ معلومات ہیں۔ فرمایا: میرے پاس ''کتاب الخیل'' ابن الاعرابی اور ابن الکلبی (۹۸) کے نسخے موجود ہیں۔ ''کتاب الخیل''، الاسود الاعرابی کا نسخہ مصر میں موجود ہے۔ افسوس کہ سفرِ مصر میں اس پر میری نظر نہ ہو سکی۔ اب جیسے ہی لڑائی ختم ہوگی، پہلے یہ کتاب نقل کراؤں گا۔ اس کے علاوہ ابوعبیدہ کی ''کتاب الخیل''، جس کا اصل نسخہ مدینہ منورہ میں ہے، حیدرآباد سے چھپ چکی ہے۔ دوسری کتاب نہایت پُرمعلومات ''الاجیاد فی الصافنات الجیاد'' (۹۹) ہے۔

۴ مئی ۱۹۴۴ء

استاذ صاحب نے آج بتایا کہ ان کو حصولِ علم میں کتنی مشکلات کا سامنا کرنا پڑا۔ لیکن انہوں نے علم کو بطورِ علم حاصل کیا اور یہ خیال کبھی نہ کیا کہ اس علم سے مجھے کیا مالی نفع حاصل ہوگا۔ نہ کبھی شہرت کا شوق ہوا۔ فرمایا کہ میری اولاد و زوجہ میرے علمی مشاغل میں ایک بڑی رکاوٹ ثابت ہوئے اور ان کی پیدا کردہ تکالیف کی وجہ سے ان کو خوشی کے لمحے بالکل کم نصیب ہوئے۔

۶ مئی ۱۹۴۴ء

استاذ صاحب کو عرض کیا گیا کہ وہ ڈاکٹر حسین بن فیض اللہ ھمدانی پروفیسر اسماعیلی کالج اندھیری کو خط لکھیں تاکہ وہ ''اسماعیلی تعلقات بہ سند'' کے متعلق ہماری رہنمائی کریں۔ استاذ صاحب نے حسبِ ذیل لیٹر لکھا:

صدیقی الاستاذ الفاضل ح۔ف۔ب الھمدانی حرسه الله

السلام علیکم ورحمة الله ورضوانه

هذا کتاب إلیکم والحمد لله علی الصحة والسلامة داعیا لکم بمثلها بعد طول الزمن، بحیث یخشی فیه علی عهد الودّ أن یتناسی، وجعل الصفاء أن یخلق کر الجدیدین دیباجته، ومکن أهل الحفاظ یحافظون وازاک فی رعیلهم الأول:

الطالب الراغب نبی بخش بلوص بعد حیازته علی شهـــادة المجسیتر رغب فی تقدیم أطروحة علی "العرب والسند"

وهـا هـوذا امـا من یجمع من الزوایا خبایا ویثیر عن المعادن کی یفوز ببغیته

ومعلوم أن الإسماعیلیین کانت لهم فی آخر القرن الرابع صلة بهذه البقاع، وکانت متعربین بین دعاتهم بها ویولاة مصر وخلفائها مکاتبات عن أخبارها وشؤونها۔ وهی من الأهمیة بمکان۔ ولیس له إلا صدیقی، فإنه ابن بجدته وابن غور أرضه۔ ارجوه أن یسعفه ببغیته ویجعل ذلک منة علیّ إلی مننه

والسلام

عبدالعزیز المیمنی

۶۔مایو سنه ۱۹۴۴ء

علیگره

۱۵ مئی ۱۹۴۴ء

پرسوں سے میری طبیعت خراب تھی۔آج جب کہ میں طبیہ کالج کو دوا کے لیے جا چکا تھا، تو استاذ صاحب بیمار پرسی کے لیے کمرے میں تشریف فرما ہوئے ،لیکن مجھے غیر حاضر دیکھ کر واپس چلے گئے۔اس کے فوراً بعد میں واپس آیا۔استاذ صاحب کے متعلق معلوم ہوا کہ آئے تھے۔میں نے سمجھا کہ ابھی استاذ صاحب شاید لائبریری میں ہوں گے اور میں فوراً وہاں پہنچا۔استاذ صاحب موجود تھے۔آپ نے صحت کے متعلق پوچھا۔اس کے بعد اور باتیں ہوتی رہیں۔

بالآخر ڈپٹی نذیر احمد صاحب کے متعلق باتیں ہوئیں۔استاذ صاحب نے فرمایا کہ وہ

شکل کے سرخ سفید تھے، مزاج میں تیزی زیادہ تھی۔ اگر غصے میں ہوتے تھے تو شیر ژیاں کی مثل گرجتے تھے۔ لیکن ساتھ ساتھ اگر کسی کے ساتھ ان کی محبت ہوجاتی تھی تو اس کے ساتھ نہایت اچھا برتاؤ کرتے تھے۔ استاذ صاحب نے فرمایا کہ میرے ساتھ وہ خاص شفقت کیا کرتے تھے۔ انہوں نے مجھے چند کتابیں بھی دی تھیں، جن میں سے ایک ''حماسہ'' ہے، جو ابھی تک میرے پاس موجود ہے (بمبئی کا ایڈیشن جواب سندھ یونیورسٹی میں آگیا ہے)

ایک مرتبہ کہا کہ ''شرح حماسہ تبریزی'' (۱۰۰) لے جاؤ، لیکن میں نے قبول نہ کیا اور عرض کیا کہ یہ آپ خود پڑھاتے ہیں، اس وجہ سے آپ کے یہاں رہے تو بہتر ہے۔ پھر فرمایا کہ میرے کتب خانے میں سے جو کتاب تم چاہو، وہ لے جاؤ۔ استاذ صاحب نے فرمایا کہ ان کی کتابوں کی دو الماریاں تھیں اور جو چاہتا تھا وہاں سے کتاب اٹھا لے جاتا تھا۔ تبریزی کے ذیل میں صراحت کی کہ کتب خانہ قونیہ میں ''مفضلیات'' کی شرح تبریزی کا نسخہ خود تبریزی کے اپنے ہاتھ کا لکھا ہوا موجود ہے۔

فرمایا کہ ان کے مکان کے دو حصے تھے۔ زیریں منزل میں تو ادھر ادھر کتابوں کے ڈھیر پڑے رہتے تھے۔ جو وہ خود چھپواتے رہتے تھے۔ اور بالا خانے میں وہ گاؤ تکیہ لگائے لیٹے رہتے تھے، اور حقہ سامنے رہتا تھا، اور وہاں جو طالب علم پہنچتے تھے، ان کو بھی پڑھا دیتے تھے۔

فرمایا کہ ڈپٹی صاحب نہایت سادہ زندگی بسر کرتے تھے۔ ان کے ماہانہ کھانے پر کوئی پندرہ روپیہ لگتے تھے، اور پانچ سات روپیہ حقہ بھرنے والے نوکر کو دے دیا کرتے تھے۔ ویسے زندگی میں پیسہ بہت کمایا تھا۔ فرمایا کہ مجھے ڈپٹی صاحب نے بتایا کہ میری تنخواہ ایک وقت اٹھارہ سو روپیہ تک پہنچ چکی تھی۔

اور یہ بتایا کہ پہلے ہی میں گورکھ پور ''محکمہ بندوبست'' میں کام کیا کرتا تھا۔ جب لارڈ کرزن آیا تو میں نے عربی میں ان کی تعریف میں ایک چھوٹا قصیدہ لکھا، جس کی وجہ سے فورا میری تنخواہ تین سو سے چھ سو روپے کر دی گئی۔

استاذ صاحب نے فرمایا کہ اس قصیدے کے چند شعر ڈپٹی صاحب نے ہمیں اس وقت

سنائے تھے، جب کہ ہم متنبّی پڑھ رہے تھے اور ''وامتقعت تلونا'' کے الفاظ آئے اس وقت کہا کہ میں نے بھی یہ الفاظ استعمال کیے ہیں اور یہ شعر پڑھے جو اس قصیدے میں سے تھے:

ولی عمل بالبند وبست ومحنة

أکا بـدهـا بالـصبر منذ شان

فهـذا بلائی وامتقعت تلـونا

وهـذا مشیبی شبت قبل أوان

استاذ صاحب نے رامپور کے مشہور شاعر امیر اللہ تسلیم شاگرد غالب کے یہ دو شعر سنائے جو استاذ صاحب نے کہا کہ خود انہوں نے ان کو سنائے تھے۔

''آسمان گردش میں ہے میرے ستانے کے لیے

چکیاں تو چل رہی ہیں ایک دانے کے لیے

(دوسرا شعر درج نہ ہوسکا)

استاذ نے ان کو ۱۹۱۱ء کے قریب دیکھا تھا، دبلے پتلے اور بہت بوڑھے تھے۔

<u>۱۹ مئی ۱۹۴۵ء</u>

جناب استاذ صاحب سے درخواست کی گئی کہ ڈاکٹر زاہد علی نظام کالج حیدر آباد دکن کو خط لکھیں تاکہ اسماعیلی لٹریچر میں سے کچھ حوالے نقل کر کے بھیجیں۔ استاذ صاحب نے فوراً ہی یہ خط لکھا:

مکرم و معظم جناب ڈاکٹر زاہد علی صاحب

پروفیسر نظام کالج حیدر آباد

صدیقی الکریم السلام علیکم

ایک عرصے سے خیریت مزاج معلوم نہیں ہوئی رعاکم اللہ

اس وقت ضرورت یہ پیش آئی ہے کہ ہمارے ہاں ریسرچ میں نبی بخش بلوچ ایک محنتی طالب العلم ہیں۔ وہ السند والعرب پر اپنا مقالہ تیار

کریں گے۔اس سلسلے میں جہاں بیسیوں مصادر سے کام لیا گیا ہے، وہاں
فاطمی داؤدی ادبیات میں جہاں کہیں ان کی الدعوۃ بالسند والدعاۃ وتاریخ
السند وجغرافیتھا کے سلسلے میں چھوٹے بڑے جو حوالے آپ کی نظر میں
ہوں، ازراہ کرم ان کے اقتباسات، احوالات بھیج کر ممنون فرمائیں۔
ان کے طرق ودعوت اور ابتدائی مراکز وغیرہ کے سلسلے میں بھی
کچھ روشنی ڈالیں۔آپ کا شکریے کے ساتھ ذکر کیا جائے گا۔ والسلام

مخلص
عبدالعزیز المیمنی
مسلم یونیورسٹی علیگڑھ

[پس نوشت: آج تصحیح کے لیے استاذ صاحب کے سامنے یہ تحاریر پڑھنا شروع کر دیں۔استاذ صاحب حیدرآباد سندھ سعید کے پاس آئے ہوئے ہیں ۷ آگست ۱۹۶۸ء ن۔ب]

۲ دسمبر ۱۹۴۵ء

آج استاد صاحب کی صحبت میں کافی وقت گذارا اور اس اثناء میں استاذ صاحب نے مولانا ابوبکر شیث مرحوم سابق پیش امام وناظم دینیات مسلم یونیورسٹی کی حسنات ومکارم الاخلاق پر گفتگو کی۔

فرمایا کہ مولانا ابوبکر صاحب متعدد خوبیوں کے انسان تھے۔مجاہدانہ جذبہ، کرم وسخاوت محبت وشفقت میں بے مثال تھے۔ہر وقت ان کے ہاں دوست واحباب کا ایک ہجوم رہتا تھا۔اور ہر قسم کے اشخاص ان کے یہاں آیا کرتے تھے۔بزرگان ومولوی صاحبان کے علاوہ بہت سے کوٹ پتلون والے نیز ان کے ہاں حاضر ہوتے تھے۔

طلبہ کو بچوں کی طرح سمجھتے تھے۔مسجد کی مرمت اور سنگھار میں ان کا بڑا ہاتھ تھا۔شکار بھی کھیلا کرتے تھے۔اس کے ساتھ علم میں بھی وہ ممتاز تھے۔عربی، فارسی، اردو پر کافی عبور

تھا۔نہایت نایاب کتابوں کا ذخیرہ ان کے پاس موجود تھا۔استاذ صاحب نے فرمایا کہ انہوں نے ''شرح القصیدۃ الحمیریۃ'' کا قلمی نسخہ ہدیۃً مجھے پیش کیا اور مولانا کی اس علمی سخاوت پر مجھے نہایت تعجب ہوا اور ان کے لیے دل میں عزت پیدا ہوئی،تالیف نشوان حمیری (۱۰۱)۔یہ کتاب حال ہی میں صنعاء والوں نے یمن میں چھاپی ہے یا مصر میں چھپ گئی ہے۔مولانا نے جو نسخہ استاذ کو دیا،وہ یمانی ہے۔قصیدے کا پہلا شعر:

الامر جِدٌّ وهـــــو غير مزاح

فاعمل لنفسک صالحا يا صاح

استاذ صاحب نے فرمایا کہ وہ ہمیں نہایت عزیز سمجھتے تھے۔کبھی ان کے ہاں حاضر ہونے میں ناغہ ہو جاتا تو پوچھتے تھے۔بیماری کے عرصے میں اتفاقاً مجھ سے ناغہ ہو گیا۔انہوں نے فرمایا کہ آپ کیوں نہیں آیا کرتے اور یہ شعر پڑھا:

تمتع من شميم عرار نجد

فما بعد العشية من عرار (۱۰۲)

یہ بیماری کا شروع تھا،جب بول سکتے تھے،بعد میں تو بول نہیں سکتے تھے۔تکلم بند ہو گیا۔اس کے بعد استاذ صاحب نے فرمایا کہ میں کوشش کر کے ان کے یہاں حاضر ہوا کرتا تھا۔ اس بیماری میں صندل کا عطر منگوایا۔سب حاضرین کو خوشبو دی اور بعد میں مجھے اشارتاً کہا کہ یہ بوتل تم اپنے پاس رکھو۔

استاذ صاحب نے فرمایا کہ یہ بوتل مع عطر آج تک میرے یہاں تبرکاً محفوظ ہے۔

استاذ صاحب نے فرمایا کہ مولانا صاحب پر مرض غالب آ گیا۔متعدد علاجوں سے کچھ فائدہ نہ ہوا۔مرض دن بدن بڑھتا جاتا تھا۔مگر اس مردِ خدا نے کبھی ناامیدی کا اظہار نہیں کیا۔ اگر کوئی اور شخص اس قسم کا اظہار کیا کرتا تھا،تو اس کو فوراً ڈانٹ دیا کرتے تھے،بڑے توکل کے مالک تھے۔

۱۸ جنوری ۱۹۴۵ء

أُخَيَّيْنِ كُنَّا فَرَّقَ الدَّهْرُ بَيْنَنَا
إلىٰ أَمَدٍ وَّالْمَرْءُ لَا يَأْمَنُ الدَّهْرا(۱۰۳)

(هذا الشعر بخط الاستاذ الكريم)

استاذ صاحب نے پچھلی کسی ملاقات میں یہ شعر پڑھا تھا۔اور شاید مولانا ابو بکر مرحوم کی وفات و مفارقت کے سلسلے میں۔اور فرمایا کہ یہ شعر سیبویہ نحوی نے اپنی وفات سے پیشتر پڑھا، جب کہ اس کا بھائی اس کی مفارقت پر رو رہا تھا۔آج بندے کی درخواست پر استاذ صاحب نے نابینا ماسٹر کے ہاں یہ شعر لکھ دیا۔

[صنعتین]

زروئے یار خواہم ضد شرقی
بہ تقلیب و بہ تصحیف و بہ تجنیس

(بخط الاستاذ)

شرقی۔غربی۔عربی۔ربیع۔بہار۔یوم۔موی۔شعر۔شعر۔بیت۔دار۔راد۔زاد۔توشہ۔بوسہ: (مأخذ: شاید بحر الفصاحت لمولوی نجم الدین رامفوری)

اوپر کا شعر آج صبح استاذ صاحب نے دوران درس میں ففتھ ایر'' کلاس کو پڑھ کر سنایا۔اس سلسلے میں کہ کبھی اشارتاً بات کہہ دی جاتی ہے اور سننے والا خود اس سے اندازہ لگا کر صحیح معنی معلوم کرتا ہے۔استاذ صاحب ''کامل للمبرد'' پڑھا رہے تھے۔ایک شعر میں ''ذو'' لفظ مستعمل تھا، جس سے مبرد نے ظن کیا کہ یہ شعر بنوطی میں سے، کسی کا ہے ''ذو'' بمعنی الذی، یہ زبان بنوطی کی ہے۔

استاذ صاحب طالب علم کی اتنی دل کھول کر امداد کرتے ہیں کہ کئی غیر علمی مشکلات نیز آسان ہو جاتی ہین اور ہمت وحوصلہ بڑھ جاتا ہے۔آج خدمت میں حاضر ہوا اور عرض کیا کہ رامپور کتب خانے سے استفادہ کرنے کا ارادہ ہے۔استاد صاحب نے فوراً تائید کی اور ساتھ لے چلے اور اپنی کوٹھی پر دو خط لکھے، ایک جناب سید بشیر حسین صاحب زیدی مدار المھام ریاست

رامفور رکو اور دوسرا جناب امتیاز علی صاحب عرشی مہتمم کتب خانہ کو۔ دونوں خطوط روانہ کر دیے گئے۔ اور اگر اللہ نے چاہا تو آئندہ جمعرات کو رامپور کو روانہ ہوں گا۔ و باللہ التوفیق۔

۲۲ فروری ۱۹۴۵ء

استاذ صاحب کو اللہ پاک نے قوت حافظہ کی نعمت دل کھول کر عطا کی ہے۔ محترم قادر بخش نے ذکر کیا کہ ڈاکٹر یوسف صاحب، زہیر بن ابی سلمی کے شعر پر ایک مقالہ پڑھ رہے تھے اور شواہد کے لیے دیوان میں سے قصائد ابیات نکال نکال کر پڑھ رہے تھے۔ استاذ صاحب مجلس کے صدر تھے، انہوں نے یوسف صاحب کو فرمایا کہ دیوان کھولنے کی زحمت گوارا نہ کیجیے۔ آپ ابیات کا پہلا لفظ بتادیں اور ہم پڑھتے رہیں گے اور اس طریقے پر استاذ صاحب شعر پڑھتے رہے اور ڈاکٹر صاحب مقالہ۔ مجھے یہ تعجب ہے کہ استاذ صاحب کی روزانہ گفتگو اکثر گھر کی ضروریات کے متعلق ہوتی ہے مثلاً: لکڑی، گیہوں، کوئلہ وغیرہ اور ان جنجال کے ہوتے ہوئے، اشعار و ادبی نکات وہ ہرگز نہیں بھولتے۔

۲۴ فروری ۱۹۴۵ء

آج شام کو استاذ صاحب کی معیت میں شام کی سیر نصیب ہوئی۔ راستے میں حاذق صاحب ملے اور استاذ صاحب کو کہا کہ میں نواب بہاولپور کے ولی عہد کی شادی کے موقع پر ایک مدحیہ قصیدہ لکھ رہا ہوں جس میں ابونواس (۱۰۴) کے شعر

لقد ضاء شعری علی بابکم

کما ضاء عِقد علی خالصة

کے پہلے مصرع کو نیز لانا چاہتا ہوں، البتہ آخری فقرے کو حسب ضرورت بدلنا چاہتا ہوں۔ آپ امداد کیجئے۔ استاد صاحب نے ان کو ایک طریقہ ان کے قافیے کے حسب حال بتادیا۔ اور آخر میں فرمایا کہ بہتر ہوگا اگر آپ اس شعر کو نہ استعمال کریں، کیونکہ اس میں ایک بڑی غلطی ہے، وہ یہ کہ فعل ''ضاء'' عربی مین سرے سے ہے ہی نہیں۔ حاذق صاحب حیران رہ گئے، مجھے بھی تعجب ہوا۔ استاذ صاحب نے تشریح کی کہ یہ فعل ''اَضاء'' کی صورت میں آتا ہے اور ''ضاء'' کی

صورت میں کسی کتاب میں نہیں آیا۔ یہ صرف یارھویں (گیارھویں) اور بارھویں صدی کے عربی دانوں کی ایجاد ہے، اور ''نفحۃ الیمن'' والے حضرت کی ایک بڑی غلطی کا ثبوت ہے۔

۷ مارچ ۱۹۴۵ء

شام کو استاذ صاحب اور ڈاکٹر یوسف صاحب کی معیت میں سیر کی، استاذ صاحب نے فرمایا کہ احمد تیمور پاشا کو شریف ادریسی کے جغرافیے سے نہایت شغف تھا۔ لہذا انہوں نے جملہ مطبوعہ وغیر مطبوعہ ٹکڑے جمع کیے۔ اور وہ جملہ ٹکڑے ان کے کتب خانے میں موجود ہیں۔ احمد تیمور کا کتب خانہ، دار الکتب المصریہ میں پہنچ گیا ہے اور محفوظ ہے۔

میں نے استاذ صاحب سے ان کا لکھا ہوا ''مولانا ابو عبداللہ السورتی پر رد'' مطالعے کے لیے حاصل کیا۔ سورتی صاحب نے استاذ صاحب کے خلاف ایک غیر منصفانہ محاذ قائم کر کے اپنے علم کو گندا کر دیا۔ انہوں نے استاذ صاحب کی ''کتاب السمط'' (۱۰۵) پر رد لکھ کر تفوق حاصل کرنے کی کوشش کی، مگر استاذ صاحب کے جواب نے مرحوم کو ہمیشہ کے لیے سلا دیا۔ استاذ صاحب نے ان کے علم کا پول کھول دیا۔ کاش کہ سورتی صاحب یہ حرکت نہ کرتے اور نہ رسوا ہی ہوتے۔ لیکن استاذ صاحب سے یہ معلوم کر کے اور بھی افسوس ہوا کہ مولانا سورتی کے حواریین نے سورتی صاحب کی وفات کے بعد پھر سورتی صاحب کی اس حرکت کی یاد تازہ کر دی۔ اور ''اسلامک کلچر'' میں مرحوم سورتی پر جو مضمون لکھا ہے، اس میں ان کی تصنیفات میں سے ''الرد علی سمط اللآلی'' کے نام کو نیز اچھالا ہے۔ حالانکہ وہ علمی رد نہیں، بلکہ اپنے جہل کا اشتہار ہے۔

استاذ صاحب اپنی باتوں میں بندے کے متعلق اچھے اچھے الفاظ استعمال کر کے ہمیشہ ہمت افزائی کیا کرتے ہیں۔ اور سلسلۂ تجسس کی تعریف کر کے حوصلہ بلند کر دیتے ہیں۔ (حالانکہ می دانم کہ من کیستم۔ نبی بخش۔ تجھے چاہیے کہ کچھ اور آگے بڑھ اور خود میں صحیح لیاقت پیدا کر۔ فاللھم حقق الآمال)

۱۶ مارچ ۱۹۴۵ء

استاذ صاحب نے السیوطی کے متعلق فرمایا کہ ہر فن مولیٰ بننے کی وجہ سے ان کے کام

ادھورے رہ گئے ہیں۔استاذ صاحب نے ''شرح شواہد مغنی'' نکال کر تقریباً دس ابیات ایسے دکھائے جن کا سیوطی پتا نہ چلا سکا۔لیکن استاذ صاحب نے سب کا پتا بتا دیا۔اور ایسے کئی اشعار کا پتا بتا دیتے اگر ٹائم کی گنجائش ہوتی۔ حافظ مغلطائی (۱۰۶) کے متعلق ذکر آیا۔فرمایا کہ ان کا علم الانساب اور حدیث میں نہایت بلند درجہ ہے۔ انساب و رجال میں اول درجے کے ہیں اور حدیث میں دوسرے درجے پر، لغات پر بھی ان کا اچھا خاصا عبور ہے۔سیرت پر چھوٹی کتاب (۱۰۷) پورا'' روض الانف'' (۱۰۸) کا خلاصہ لیکن معلومات اس سے بھی زیادہ۔ روض الأنف پر حاشیہ بھی لکھا۔

بانکی پور میں شرح سنن ابن ماجہ خود مغلطائی کے ہاتھ کی (۱۰۹) موجود ہے۔دوسرا نسخہ استنبول میں موجود ہے۔کتب خانہ ملت استنبول ،صرف ایک جلد۔اسی طرح بانکی پور میں ایک جلد۔غالباً کتاب دو چار جلدوں میں تھی۔

۲۱ مارچ ۱۹۴۵ء

آج فہرست سازی کے متعلق ذکر آیا۔استاذ صاحب نے فرمایا کہ گو یورپ والوں نے اس فن کو اہمیت کے ساتھ پیش کیا۔لیکن علمائے اسلام نے نیز فہرستیں بنائی ہیں۔فرمایا کہ طباعت سے پیشتر فہرست سازی مفید بھی نہیں تھی۔کتابیں نقل کی جاتی تھیں،لہٰذا ہر عالم کے پاس جداگانہ نسخہ ہوتا تھا۔فہرست اس وقت کام کی ہے جب پڑھنے والوں کے پاس ایک ہی ایڈیشن موجود ہے۔یہ صرف طباعت کے بعد ممکن ہو،لیکن تاہم حسب ضرورت علماء نے فہرستیں بنائی ہیں۔

سیوطی نے ''بغیۃ الوعاۃ'' (۱۱۰) کتاب کے آخر میں انڈیکس دی ہے۔نو اخفش کے نام درج کرنے کے بعد پھر اخفش میں نو کے نو اسماء کو لاتا ہے تاکہ اخفش مطلوب فوراً تلاش سے مل جائے۔اسی طرح فرمایا کہ ابن حجر نے بھی اپنی کتاب ''اصابہ'' (۱۱۱) میں فہرست دی ہے۔استاذ نے ''السمط'' میں فہرست عروف پر بنائی ہے۔استاذ نے کہا کہ یہ کیونکہ مجھے سب کے عرف معلوم ہیں،دوسرے علماء یہاں تک نہیں پہنچتے۔الزرکلی نے اپنی ''الأعلام'' میں عَلَم کے اصول پر بنائی ہے۔

۲۹ اپریل ۱۹۴۵ء

صبح کو ڈپارٹمنٹ میں استاذ صاحب تشریف لائے۔ ''کشف الظنون'' کا ذکر آیا۔ فرمایا کہ یہ محض اسماء کتب اور مؤلفین کی فہرست ہے، باقی حالات از روئے صحت بالکل ناکارہ۔ فرمایا کہ ہر کتاب کے حالات میں اس کے مصنف، کتاب کے نام، فن وغیرہ اس کے ہر ایک بیان میں غلطی کا احتمال ہے۔ ممکن ہے کہ کتاب کا نام کچھ اور ہو۔ اس کے مصنف کا نام کچھ اور ہو وغیرہ۔ صرف اتنا معلوم ہوگا کہ دراصل کچھ چیز ہے و بس۔ اسمٰعیل بغدادی کی ''ذیل کشف الظنون'' کا بھی یہی حال ہے، لیکن ایک ضرورت کو دونوں پورا کرتی ہیں۔

ڈیڑھ بجے کے قریب ڈاکٹر یوسف صاحب کی معیت میں استاذ صاحب کے ہاں گئے ''جمہرۃ الاشعار'' (۱۱۲) کا ذکر آیا۔ فرمایا کہ علی گڑھ سبحان اللہ کلیکشن والا نسخہ دنیا میں شاید قدیم ترین نسخوں میں سے ہے۔ باقی نسخے سب دسویں صدی کے عہد کے ہیں۔ فرمایا کہ ایک اورینٹلسٹ نے تقریباً ۱۵ نسخوں کو سامنے رکھ کر اس کتاب پر مضمون لکھا ہے، جو اس کتاب کے متعلق ہونے کی وجہ سے حاصل کرنے کے قابل ہے۔ فرمایا کہ میں نے کتاب پر سنجیدگی سے غور کیا ہے۔ مقدمے میں اسناد نہایت غلط ہیں۔ کتاب یقینی پرانی ہے اور کوفیوں کی روایت ہے۔ تیسری صدی میں یہ کتاب جمع کی گئی، چوتھی صدی کے بعد ابن رشیق نے ''عمدہ'' میں اس مصنف کا حوالہ دیا ہے۔ مصنف کا نام بھی کچھ الٹا سلٹا لکھتے ہیں۔ فرمایا کہ مجھے گمان ہے کہ کتاب کا مصنف شاید محمد بن أبی الخطاب (۱۱۳)، سیبویہ کے استاد سے نسبت رکھتا ہو۔ حالانکہ نام میں غلطی ہے۔

فرمایا کہ محمد بن ابی الخطاب نے پہلی مرتبہ عربی اشعار جمع کر کے، ہر ایک بیت کے نیچے اس کی شرح لکھنی شروع کی ''جمہرۃ'' میں نیز یہی ترتیب پائی جاتی ہے۔ جزاہم اللہ۔ اس سے پہلے علماء پورا قصیدہ نقل کر کے پھر شرح لکھتے تھے۔ ملاحظہ ہو ''اشعار ھذیل''، پہلا ایڈیشن یورپ۔

۱۳ مئی ۱۹۴۵ء

فاتک (۱۱۴): شاہی خاندان میں سے تھا۔ متنبیؔ کو اس سے محبت تھی۔ کافور اخشیدی نے

متنبی کا خیال نہ رکھا۔ کافور اخشیدی غلام پر مرثیہ لکھا۔

قبحا لـــوجهک یازمان فانه
وجـــه لـه من کل لوم برقع
ایموت مثل أبی شجاع فاتک
ویعیش حاسده الخصی الأوقع

فرمایا کہ ابوحنیفہ الدینوری بڑے فاضل آدمی تھے۔ ''کتاب النبات'' کا مصنف، جو چھے جلدوں میں تھی، بغدادی کو ملی تھی۔ شیراز کے ایک رئیس کے ہاں مبرد اور ابوحنیفہ جمع ہوئے ''شاۃ مجسمہ'' (حدیث میں ہے کہ جانور زمین پر بیٹھے تو گردن سے نہ کاٹا جائے) کے معنی کے متعلق ذکر آیا۔ مبرد نے معنی بتا کر شاہد پیش کیا۔ ابوحنیفہ نے صحیح معنی بتائے اور مبرد کے شاہد کے متعلق کہا کہ یہ شیخ نے خود گھڑا ہے۔ مبرد نے اعتراف کیا۔ (راجع لترجمۂ أبی حنیفہ معجم الأدباء لیاقوت) ساری دنیا کا اجماع ہے کہ ایسی کتاب عربی زبان ہی میں نہیں۔

۲۴ مئی ۱۹۴۵ء

استاذ صاحب عربی سیمینار کمرہ میں جہاں اس تعطیل کے زمانے میں میرا قیام ہے، تشریف لائے۔ ''ابوالعلاء و ماالیہ'' کی تصنیف کا سبب بیان فرمایا کہ شاید ۱۹۲۳ء میں کاٹھیاواڑ سے لاہور واپس آیا کہ ڈاکٹر عنایت اللہ نے مجھے بتایا کہ مولوی خلیل احمد صاحب کی وفات کی وجہ سے علی گڑھ میں عربی لیکچرر کی جگہ خالی ہوئی ہے اور آپ اپنی درخواست روانہ کریں اور خود بھی علی گڑھ پہنچیں۔

استاذ صاحب نے فرمایا کہ میں نے درخواست روانہ کر دی۔ اور علی گڑھ کا سفر اختیار کیا۔ اس وقت ابوالعلاء کی کتاب ''لزوم مالا یلزم'' کو دوران سفر میں دیکھ رہا تھا اور مجھے احساس ہوا کہ ابوالعلاء کو سمجھنا آج کل کے عربی خواندوں اور مستشرقین کے امکان سے باہر ہے، اس لیے میں نے ارادہ کر لیا کہ ابوالعلاء کے متعلق لکھوں گا۔ لاہور پہنچتے ہی میں نے ابوالعلاء کے متعلق لکھی ہوئی کتابوں کا مطالعہ کیا۔ صرف جو کچھ مارغیولیوث نے رسائل ابی العلاء کے مقدمے میں

ابوالعلاء کے متعلق لکھا تھا، یا جو طہ حسین مصری نے ''ذکری أبي العلاء'' میں لکھا تھا، قابل التفات نظر آیا، باقی لوگوں کی لکھی ہوئی کتابیں اس قابل ہی نہیں تھیں کہ ان کی طرف کوئی توجہ کی جائے۔ اور اسی لیے میں نے مقدمے میں ان کے متعلق حدیث شریف کے یہ کلمات کہہ دیے کہ:

''جرح العجماء جبار'' (۱۱۵)

اس کے بعد استاذ صاحب نے ابوالعلاء کی ترتیب کے متعلق سمجھایا۔

اسلامک کلچر میں ہندوستان پر عربوں کے اوائلی حملوں کے متعلق ایک مضمون ہے۔ اس کا جواب آج ختم کرلیا اور استاذ صاحب کو دکھایا۔ لکھنے والے کی غلطیوں کے متعلق استاذ صاحب کو بتایا تو ان کی غلطیوں کو سن کر ان کے متعلق استاذ صاحب نے یہ شعر پڑھا۔

فإن كنت لا تدري فتلك مصيبة

وإن كنت تدري فالمصيبة أعظم (١١٦)

چنانچہ اس شعر کو نیز اپنے جواب میں جگہ دی گئی۔

کل نابینا اسکول میں استاذ صاحب نے عنقاء (سی مرغ) اور خالد بن صفوان عربوں کے نبی، یعنی أصحاب الرس کے نبی کے متعلق کچھ بیان کیا اور عنقاء کے متعلق ابوالعلاء کا یہ شعر پڑھا۔

أرى العنقاء كبر أن تصادا

فعاند من تطيق له العنادا

تعطیل گرما کے بعد یہ پہلی مرتبہ ہے کہ استاذ صاحب سے ادبی معلومات حاصل کرنے کا موقع ملا۔ میں نے دریافت کیا کہ الزجاجی (۱۱۷) نے نیز ''أمالي'' لکھی تھی۔ فرمایا کہ اس نے تین أمالی لکھیں۔ صغری، وسطی، کبری۔ فرمایا کہ صغری چھپ چکی ہے اور طالب علمی کے زمانے میں میری حفظ کی ہوئی کتابوں میں سے ہے۔

الزجاجی نے حرم شریف میں بیٹھ کر گرامر پر ''کتاب الجمل'' لکھی، اس نیت سے کہ مقبولیت حاصل کرے۔ چنانچہ ایسا ہی ہوا اور کسی زمانے میں یہ کتاب بے حد مقبول تھی۔ فرمایا کہ

کتاب یورپ میں چھپ چکی ہے۔ ہندوستان میں یہ چھپا ہوا نسخہ صرف رامپور کے کتب خانے میں موجود ہے۔ دنیا اس کو اب تک قلمی سمجھ رہی ہے۔

فرمایا کہ استانبول کے کتب خانے میں اس کی ''کتاب المز ال (؟)'' پائی جاتی ہے۔ جس پر مجھے پہلے شبہ تھا کہ شاید یہ اس کی ''اُمالی'' ہے۔ لیکن معلوم کرنے پر اُمالی صغریٰ تو نہیں، ممکن ہے کہ وسطیٰ یا کبریٰ ہو۔ فرمایا: الزجاجی بڑے خدا پرست آدمی تھے۔ ان کی نسبت الزجاج (۱۱۸) کی طرف ہے، جو مبرد کے شاگرد تھے۔

اس کے بعد کلام کا سلسلہ ابن درید تک پہنچ گیا۔ فرمایا کہ ابن درید، المبرد و ثعلب کے شاگردوں کے دور کا ہے۔ مگر علمیت میں ان سے کم نہیں۔ کیوں کہ ابن درید نے نیز بجستانی سے پڑھا جو مبرد کا استاد ہے۔ فرمایا کہ ابن درید کا درجہ، لغت میں بہت ہی اونچا ہے۔ یہ جو کتاب ''جمہرۃ اللغہ'' کے متعلق کہا گیا ہے کہ اس نے ''کتاب العین'' سے چرائی ہے، محض ہذیان ہے اور وقتی رقابت کا نتیجہ ہے۔

فرمایا کہ کتاب ''الجمہرۃ'' بے نظیر کتاب ہے اور ابن درید نے یہ پوری کتاب اپنے حفظ سے املاء کرائی۔ فرمایا کہ ابن درید لغۃ کا امام ہوتے ہوئے، ''مقصورہ'' میں اس نے اپنے بے مثال شاعر ہونے کا بھی ثبوت دیا ہے۔ استاذ صاحب نے مقصورہ کی بہت تعریف کی۔ فرمایا کہ ابن درید خارجیوں کے خاندان میں سے تھا۔ حال ہی میں مصر کے ایک اورنیٹلسٹ اور خارجیوں کے سردار نے ایک کتاب کے مقدمے میں لکھا ہے کہ ابن درید کا خاندان خارجیوں میں سے تھا، جس کے دو ثبوت ہماری کتابوں میں موجود ہیں۔ فرمایا کہ ابو عبیدہ نیز خوارج کی طرف منسوب ہے اور ابو خلیفہ الجمحی جو بخاری کے استادوں یا اساتذہ کے اساتذہ میں سے ہے، وہ نیز خارجی تھا۔

فرمایا کہ فلاں نے ان کے کتب خانے میں ''دیوان عمران بن حطان'' کا مطالعہ کیا۔ ابو خلیفہ نے ان سے پوچھا کہ کون سی کتاب دیکھ رہے تھے۔ اس شخص نے جواب دیا کہ ''دیوان عمران بن حطان'' اس پر ابو خلیفہ نے طیش میں آکر اس شخص کو کہا کہ کہو ''دیوان امیر المومنین حضرت

عمران بن حطان لاام لک''

۱۱۔اگست ۱۹۴۵ء

آنریبل پیر الٰہی بخش صاحب ایڈوکیشنل منسٹر سندھ گورنمنٹ اور ڈاکٹر امیر حسن صاحب صدیقی پرنسپل سندھ مسلم کالج کی طرف سے خط آئے کہ مجھے سندھ مسلم کالج میں اسسٹنٹ پروفیسر مقرر کیا جائے گا، اگر میں اس پر راضی ہوں تو کراچی روانہ ہو جاؤں۔ دونوں خط استاذ کی خدمت میں رکھے۔ کیونکہ اس نادر موقع کے باوجود میں استاذ صاحب کی رائے کے خلاف قدم اٹھانا پسند نہیں کرتا۔ استاذ صاحب نے فرمایا کہ اگر وہ اس وقت یہ پوسٹ دے رہے ہیں، تو آپ کے کام کی تکمیل پر تو یقینی یہ جگہ مل جائے گی۔ میں سمجھتا ہوں کہ اپنی قابلیت بڑھانے سے اچھے نتائج پیدا ہو سکتے ہیں (لیکن سندھ مسلم کالج والے مجھے ضرورت کی وجہ سے یہ جگہ دے رہے ہیں۔ میری علمی لیاقت کی وجہ سے وہ یقینی نہیں دے رہے) بہر حال استاذ صاحب نے فرمایا کہ میں خود پیر الٰہی بخش صاحب کو خط لکھ رہا ہوں، کہ وہ اس وقت آپ کو اپنے کام ختم کرنے کا موقع دیں۔ اور استاذ صاحب نے یہ خط پیر الٰہی بخش کے نام لکھا جو آج روانہ کر رہا ہوں۔ نبی بخش

۱۳۔اگست ۱۹۴۵ء

استاذ صاحب کا خط پیر الٰہی بخش صاحب کے نام

معظم و محترم جناب والاالقاب پیر الٰہی بخش صاحب وزیر تعلیمات سندزادفضلہ

السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ

بغیر سابقہ تعارف کے میں آپ کو تصدیع دینے کی جسارت کر رہا ہوں۔ آج عزیزی مولوی نبی بخش بلوچ ایم اے ایل ایل بی ریسرچ اسکالر نے مجھے آپ کا کرم نامہ اور مکرم ڈاکٹر امیر حسن صاحب پرنسپل کا خط بیک وقت دکھائے۔ اس لیے میں نے ضروری سمجھا کہ بلوچ صاحب کے

مضمون پر قدرے روشنی ڈالی جائے۔

"سند زیر عرب" کے عنوان پر انتہائی عرق ریزی سے یہ ریسرچ سوا دو سال سے جاری ہے، کوئی آٹھ ماہ اور رہتے ہیں۔ میں جانتا ہوں کہ ہندوستان میں آج تک گو سند و عرب پر متعدد کتابیں مسلمانوں اور غیر مسلموں نے لکھی ہیں، مگر کسی نے اتنی جانفشانی سے عربی ادبیات کے پوشیدہ گوشوں سے یہ مواد نہیں نکالا، جس کا کھوج لگانا بلوچ کے نصیب میں تھا۔ میں کاٹھیاواڑی میمن ہوں، مگر اس کام کی تکمیل کے لیے بے تاب ہوں۔ مگر آپ کا اور بلوچ کا تو سب کچھ سندھ ہے۔ **فیھا تحیون و فیھا تموتون و منھا تخرجون**۔ اگر اسی طرح آپ کی توجہ شاملِ حال رہی، تو ملازمت تو پھر بھی مل رہے گی، مگر یہ کام روزمرہ نہیں ہوا کرتے۔

محض سندھ اور سندھ کے لیے میری آپ سے التماس ہے کہ آٹھ ماہ کے لیے کوئی عارضی انتظام کر لیجیے، پھر بلوچ کو میں آپ کے حوالے کر دوں گا۔ اس سلسلے میں آپ کو عارضی ضرورت پوری کرنے کے لیے بہت سے آدمی مل جائیں گے۔ آپ کو سندھ کا واسطہ دلا کر پھر ملتمس ہوں کہ ڈاکٹر امیر حسن صاحب کو آپ خود سمجھائیے۔ اگر ممکن ہو تو ڈاکٹر داؤد پوتہ صاحب کو میرا نیاز نامہ دکھا کر استصواب کر لیجیے۔

آخر میں آپ سے اس جسارت پر طالبِ عفو ہوں۔ والسلام

ناچیز

میمن عبدالعزیز

__۲۴۔ اگست ۱۹۴۵ء__

آج ڈاکٹر امیر حسن صاحب صدیقی کا خط مع اسسٹنٹ پروفیسر کی تقرری کا آرڈر پہنچا۔ نماز کے بعد قبلہ استاذ صاحب کے سامنے رکھے گئے۔ استاذ صاحب میرے یہاں رہنے کو

کراچی جانے پر ترجیح دیتے ہیں، لیکن ساتھ ہی یونیورسٹی والوں کی بے اعتنائی اور میری ضعیف مالی حالت کو استاذ صاحب نے قدرے محسوس کیا اور فرمایا کہ ''اچھا آپ جائیں''۔ میں جانتا ہوں جو صدمہ استاذ صاحب کی جدائی کی وجہ سے میں لے رہا ہوں۔ افسوس کہ یونیورسٹی ایک شخص کو جو ڈیڑھ سو روپیہ نیز بخوشی چھوڑ دے بشرطیکہ پچاس روپے اطمینان سے مل جائیں، یہاں رہنے کا موقع نہیں دیتے۔ حقیقت یہ ہے کہ یونیورسٹی کے پورے تکلیف دہ قیام میں صرف استاذ صاحب کا ہی سہارا رہا۔ اس کے بغیر کام کرنا تو درکنار، جینا بھی مشکل ہو جاتا۔

۳۰۔ اگست ۱۹۴۵ء

استاذ صاحب سے ملاقات ۱۲ بجے دو پہر۔

فرمایا کہ ہمارے استاذ مولوی عبدالرحمٰن صاحب شاہ پوری (؟) کا انتقال ہو گیا۔ فرمایا کہ حدیث پر ان کی بڑی زبردست نظر تھی۔ علم سکھانے کا اتنا شوق تھا کہ ایک مرتبہ مجھے بخار ہو گیا تو تقریباً ایک میل خود چل کر آئے، اور تقریباً ۱۴ صفحے صحیح بخاری کے پڑھا کر گئے۔ فرمایا کہ ہمیشہ ایک یا ڈیڑھ چپاتی کھانے پر کھایا کرتے تھے۔ اس سے زیادہ کبھی نہیں کھایا۔ اور انہوں نے ۷۹ برس کی عمر پائی اور ابھی فوت ہوئے۔

اس کے بعد مخدوم محمد معین ٹھٹوی کے متعلق دریافت کیا۔ فرمایا کہ شاہ ولی اللہ کے شاگرد تھے۔ اور ''دراسات اللبیب'' پڑھنے سے معلوم ہوتا ہے کہ بڑے جید عالم تھے (اس وقت ''دراسات اللبیب'' (۱۱۹) استاذ کی چارپائی پر رکھی ہوئی تھی اور اس کو دیکھ رہے تھے۔ مخدوم محمد معین (۱۲۰) کا تذکرہ ''تراجم علماء اہل حدیث ہند'' میں سے دیکھا تھا) فرمایا کہ ''فتوحات مکیہ'' میں سے لیتے ہیں اور ایک جگہ پر ''کشف المحجوب'' کی عبارت نیز نقل کی ہے۔ فرمایا کہ ''دراسات'' میں امام ابوحنیفہ کی آراء میں سے کہیں کہیں جو اختلاف ہو سکتے ہیں، ان کا ذکر کیا ہے۔ اور لکھا ہے کہ اس سے میری مراد یہ نہیں کہ میں امام صاحب پر معترض ہوں، بلکہ میں خود امام صاحب کے قول کی پیروی کر رہا ہوں کہ جہاں میرے قول کے مقابلے میں صحیح حدیث ملے تو اس کو ترجیح دو۔ اور پھر امام ابوحنیفہ کے مناقب پر ایک باب لکھا ہے۔

استاذ صاحب نے مخدوم محمد معین کے ترجمے کے متعلق دریافت فرمایا۔شام کو میں نے استاذ صاحب کو ''الوحید آزاد نمبر'' میں سے مخدوم صاحب کا تذکرہ دکھایا۔استاذ صاحب نے پھر مخدوم صاحب کی تعریف کی ۔کہا کہ وقت کے بڑے عالم تھے اور مجھے آج کل کے کسی مولوی سے امید نہیں کہ وہ اتنا بلیغ علم رکھتا ہو۔پھر فرمایا کہ بڑے جید عالم تھے۔میں نے عرض کیا کہ آپ اگر ''دراسات اللبیب'' کی تصحیح کر دیں،تو میں سندھ میں اس کے چھپوانے کا انتظام کر دوں۔قبول فرمایا اور کہا کہ ساتھ ساتھ ہی عربی عبارات کی الجھنوں کو صاف کر دیا جائے گا تا کہ یہ کتاب ''حجۃ اللہ البالغۃ'' کی طرح ایک مستقل کتاب بن جائے۔پھر فرمایا کہ آج کل کا ذوق کچھ اور ہے۔بہتر ہوگا کہ اس کتاب کا اردو میں ترجمہ کروا دیا جائے تا کہ لوگ اس سے مستفید ہوں۔

<u>۱۲۔اکتوبر ۱۹۴۵ء</u>

۳۱۔اگست کو علی گڑھ کو خیر باد کہہ کر سندھ مسلم کالج میں بطور اسسٹنٹ پروفیسر شامل ہونے کے لیے روانہ ہونا پڑا۔سب سے تکلیف دہ بات استاذ صاحب کا فراق تھا۔لیکن ایک امید اطمینان بخش تھی کہ ۱۰/اکتوبر کو چھٹیوں میں علی گڑھ آؤں گا اور پھر مارچ ۱۹۴۶ء میں علی گڑھ آؤں گا،لہٰذا علی گڑھ سے سلسلہ منقطع نہ ہوگا اور استاذ صاحب کی زیارت،محبت اور علم سے مستفید ہوتا رہوں گا۔چنانچہ ۱۰/اکتوبر کو کراچی سے روانہ ہو کر آج ۱۲ کو علی گڑھ پہنچا۔شام کو استاذ صاحب کے دولت خانے پر گیا۔محمود ملے۔استاذ صاحب ٹہلنے چلے گئے تھے۔محمود نکلا،چائے لائے۔میرا یہ حال کہ کہیں سے بھاگ کر جاؤں اور استاذ صاحب کو جا کر ملوں۔خیر چائے سے فارغ ہو کر نابینا ماسٹر کی طرف روانہ ہوا۔دور سے استاذ صاحب کو دیکھا۔جب قریب گیا تو استاذ صاحب نے بھی مجھے دیکھ لیا اور کرسی کو چھوڑ کر آگے آئے اور آتے ہی گلے ملا لیا اور ملائے رکھا۔اس محبت وخلوص کی انتہاء سے مجھے آنسو آنے کے قریب تھے،لیکن دل تھام کر نابینا ماسٹر سے ایک دو بات کر لی۔استاذ صاحب کی مجلس اور رفاقت نصیب ہوگئی۔شکر الحمدللہ۔ایک مہینے کے لیے اس وصال کا موقع ملتا رہے گا۔

شام کو استاذ صاحب کے دولت خانے پر آیا۔استاذ صاحب سے عرض کیا کہ عروض پر

فائدہ مند کتاب کونسی ہے؟ فرمایا کہ ''قصیدہ خزرجیہ'' کی شرح لأبی بکر دمامینی ایک مبسوط کتاب ہے۔ ''مفتاح العلوم للسکاکی'' (۱۲۱) میں عروض وقوافی کا باب بے نظیر ہے۔ ''الکافی فی العروض والقوافی'' (۱۲۲) چھوٹی، لیکن نہایت جامع اور مفید کتاب ہے۔ اس کا حاشیہ کبری دمنہوری نے لکھا ہے (۱۲۳)۔ فرمایا کہ ویسے تو ابن حاجب، تبریزی وغیرہ نے نیز عروض پر کتابیں لکھی ہیں۔ لیکن خاص اہمیت نہیں رکھتیں۔ فرمایا کہ اس لحاظ سے تو مفتی سعد اللہ رامپوری کی کتاب ''عروض وقوافی'' نہایت مفید ہے۔

۲۵۔ اکتوبر ۱۹۴۵ء

شام کو استاذ صاحب سے ملاقات ہوئی۔ میں نے عرض کیا کہ میرے لیے سندھ عربوں کے ماتحت ''موضوع ریسرچ کے لیے متعین کیا گیا ہے۔ یہ گویا ۴۳۰ برس کی تاریخ ہے، لیکن شروع میں یہی خیال تھا کہ مواد بالکل کم ہے، اس لیے اتنا وسیع عرصہ رہنے دیا گیا۔ لیکن اب گہرے مطالعے کے بعد کافی مواد مل چکا ہے اور ازاں روء اتنے طویل عرصے کی تاریخ صرف پی ایچ ڈی کے لیے لکھنا مشکل ہے، لہٰذا اس موضوع میں ترمیم کی جائے اور اس کو ''السند تحت بنی امیہ'' متعین کیا جائے۔ استاذ صاحب نے اس خیال کی موافقت کی اور بعد میں فرمایا کہ جستجو کرنے والے کو سب کچھ مل جاتا ہے۔

مثال طور اپنی تصنیف ''أبو العلاء وما إلیہ'' کا ذکر کیا کہ اس سے پیشتر کئی تصنیفیں أبو العلاء پر لکھی جا چکی تھیں۔ میں نے دیکھا کہ اس وقت اس موضوع سے متعلق دنیا میں مانگ ہے، لہٰذا ابو العلاء سے دلچسپی نہ ہوتے ہوئے میں نے اس سے دلچسپی پیدا کر لی اور مولوی خلیل اسرائیلی کی وفات پر جب میں علی گڑھ میں ملازمت کے سلسلے میں حالات کو دریافت کرنے کے لیے علی گڑھ آ رہا تھا، تو میں نے المعری کے ''لزومیات'' کو اپنے ساتھ لے لیا اور دوران سفر میں ان کے مطالعے سے یہ اندازہ لگایا کہ باجود ابو العلاء پر اتنی تصانیف کے، میرے لیے میدان وسیع ہے اور یورپ کے استشراق میں اتنی گنجائش نہیں کہ ''لزوم'' کو سمجھ سکے۔ تعجب ہے کہ وزیر أبو القاسم المغربی، أبو العلاء کا بڑا دوست، اس کا پورا مرثیہ ''لزوم'' میں موجود ہے، تاہم مستشرقین کو

کچھ پتا نہیں۔ چنانچہ چار مہینے میں یہ کتاب لکھ ڈالی اور دنیا نے داد دی۔

فرمایا کہ دار الکتب کے فروغ الأدب میں بیٹھ کر اس سلسلے کی کتابیں دیکھا کرتا تھا، جس سے وہاں کے منتظم میرے سلسلے کو سمجھ گئے اور ان کتابوں کی اہمیت کو نیز سمجھ گئے۔ چنانچہ اس کے بعد انہوں نے کافی اقتباسات ان کی کتابوں میں سے لے کر چھاپ دیے، لیکن ابو العلاء کے متعلق اس وقت تک ایک دو چیزیں میرے علم میں ایسی ہیں، جس کا دنیا میں دوسرے لوگوں کو علم نہیں۔

فرمایا کہ ایک تو خود ابو العلاء کا غیر مطبوعہ رسالہ ہے المسمی ''رسالۃ الساھل والشاھج'' جو نجف اشرف میں احمد سماوی نام شیعی صاحب کے یہاں موجود ہے۔ دوم یہ کہ ابو العلاء کو زیادہ نزدیک سے دیکھنے اور سمجھنے والا ابن العدیم الحلبی (۱۲۴) تھا۔ جس نے ابو العلاء کے متعلق ''کتاب العدل والتحری دفع الظلم والتجری علی (۱۲۵) ابی العلاء المعری'' کتاب لکھی ہے۔ ابن العدیم نے تاریخ حلب بیس جلدوں میں لکھی ہے (۱۲۶)، جس میں ''احمد'' کے ذیل میں ابو العلاء کا ترجمہ ہونا چاہیے۔ مسٹر مرغیولوث نے بہت کوشش کی کہ فرانس کی لائبریری سے وہ کتاب ان کو ملے، لیکن احمد والی جلد وہاں معدوم تھی۔ استاذ نے فرمایا کہ اس جلد کا میں نے پتا لگایا ہے۔ وہ احمد تیمور پاشا (؟) کے کتب خانے میں ہے، جو ہمیشہ مقفل رہتا ہے۔ میں نے اس کو کھلوا کر خود اپنی آنکھوں سے وہ کتاب دیکھی، تو اس میں ایک سو صفحات پر مشتمل سوانح ابو العلاء کی پائی۔

استاذ صاحب نے فرمایا کہ افسوس کہ عربی علماء نیز کبھی کبھی ادبی گوہروں کی قدر نہیں کر سکتے اور ''ابو العلاء'' میں استاذ صاحب نے جو ابو العلاء کا شعر نقل کیا ہے کہ (۱۲۷)

ولقد علمت فما التمضر نافعی

انی ساتبع نیسبا لابنی سبا (۱۲۸)

اور یہ کہہ کر ''ان المراد بالتمضر ھنا التمعدد'' (۱۲۹) ایک بڑے راز کو عام کر دیا ہے۔ ان کے متعلق عبدالوھاب نجار نے کتاب کے آخر میں اپنی راء دیتے ہوئے ''بجائے داد دینے کے'' اپنی جہالت کا اظہار کیا ہے اور بے جا تنقید کی ہے۔ استاذ صاحب نے فرمایا کہ ان کی اتنی

ہولناک غلطی پر میں نے خاموش رہنا واجب سمجھا اور اس کا سرے سے جواب ہی نہیں دیا۔ البتہ استاذ صاحب نے ''ابوالعلاء'' کا نیا نسخہ دکھایا، جہاں انہوں نے عبدالوہاب نجار کی تحریر پر حواشی میں یہ عبارت لکھ دی تھی۔

الاستاذ حفظه الله لم یر أیّ ذوق الأدبی ولن تحصل علی العلم بالرکون إلی المعاجم وهذا المرزبانی یقول فی معجمه ۳۵۲ ان کان یزید بن أسید دعا قضاعة إلی التمضر ۔فقال کلثوم بن وائل:

ما ولد نا ولادة مضر

ولا لنا فی تمضر ارب

وإننا للصمیم من یمن

وغرة الناس حین ننتسب

ولا لنا تمضر ارب، وهذا ظاهر فلاحول ولا قوة الا بالله....فجزاک الله فی الدارین خیرا...السندی

<u>۲۶ اکتوبر ۱۹۴۵ء</u>

آج استاذ صاحب نے ''ابوالعلاء و ما الیہ'' (۱۳۰) کی تصنیف کا پورا سلسلہ اور اس کی خواص سمجھائیں۔ میں نے اوپر کے حواشی کے متعلق عرض کیا کہ اگر آپ یہ حوالہ تصنیف کے وقت نقل کر دیتے، تو عبدالوہاب نجار کے اعتراض کا راستہ بند ہو جاتا۔ استاذ صاحب نے فرمایا کہ بھائی میرے ذہن میں یہ سب چیزیں موجود تھیں اور میرے نزدیک یہ نظریہ مکمل اور مضبوط ہے۔ لہٰذا میں نے دیانت داری سے یہ نظریہ پیش کر دیا۔ اب میرے لیے یہ مشکل تھا کہ حقائق پیش کرتے وقت ہر کہ و مہ کی الجھنوں کا پہلے ہی اندازہ بھی کر لیتا اور اس کے سلجھانے کا سامان بھی مہیا کرتا۔ فرمایا کہ حماقت کے راستے ہزاروں ہوتے ہیں، عقل کا راستہ صرف ایک ہی ہوتا ہے۔

آج شام کو بعد نماز جمعہ استاذ صاحب کے ساتھ شہر جانا ہوا۔ ایک میری غلطی جو وعدہ کی تکمیل میں ذرا سی کمی کا باعث تھی۔ اور اس کی وجہ سے کافی تکلیف پیدا ہوئی۔ اس پر استاذ

صاحب نے نصیحت آمیز الفاظ میں تنبیہ کردی۔ فانقدنی من زلتی و نعم الشکر

نماز مغرب کے بعد حبیبی نورالحسن صاحب کی معیت میں استاذ صاحب کی خدمت میں حاضر ہوئے۔ نورالحسن صاحب نے اپنا وطن گلبرگہ بتایا، جس پر استاذ صاحب نے ابوبکر بدرالدین الدمامینی مدفون بقلعہ گلبرگہ کا ذکر کیا۔ اصل مصر کے افاضل میں سے تھے، ریشم کا کارخانہ تھا۔ قرض کی وجہ سے بھاگ کریمن آئے اور حکومت نے قرضہ ادا کر دیا۔ اس کے بعد ہندوستان کا رخ کیا اور مہائمؒ (نزدیک بمبئی) میں شیخ المہائمی (۱۳۱) کی صحبت میں رہے (شیخ مہائمی تفسیر (۱۳۲) کے مصنف ہیں) یہاں رہ کر کافی کتابیں لکھیں۔ ایک ''الوافی'' کی شرح ''المنہل الصافی'' تھی، جس کا ہندوستان میں کافی چرچا رہا۔ علاوہ اس کے ''تعلیقات علی مغنی اللبیب'' لکھی، اور دوسری کتاب ''فتح القریب علی مغنی اللبیب'' (۱۳۳) لکھ کر ختم نہیں کی تھی کہ فوت ہو گئے۔ ''قصیدہ خزرجیہ'' کی شرح میں علم عروض پر استقصائی مباحث بھر دیے ہیں۔ ان کا تذکرہ ''الدرر الکامنۃ'' لابن حجر العسقلانی میں موجود ہے۔ جس میں لکھا ہے کہ: ''مات بکلبرجہ مسموما''

اس کے بعد امام الصاغانی اللاہوری کا ذکر کیا۔ ''عباب فی اللغہ تکملۃ علی صحاح الجوھری'' اور تکملہ اور صحاح کا جمع ۔ ''مجمع البحرین'' ان کی معرکۃ الآراء تصانیف ہیں، جو استاذ صاحب نے فرمایا کہ خود ان کے ہاتھ کی لکھی ہوئی میں نے دیکھی ہیں۔ ''عباب''، ''بکم'' کے مادے پر ختم ہوتی ہے جس کے متعلق استاذ صاحب نے شعر پڑھ کر سنایا (۱۳۴)۔

۵ نومبر ۱۹۴۵ء

چونکہ ۱۴ نومبر کو واپس جانے کا خیال ہے، لہٰذا استاذ صاحب کے ارشاد کے مطابق دو چار دن سے روزانہ صبح و شام ان کی معیت میں سیر و تفریح کا پروگرام بنا ہوا ہے۔ کل آپ نے فرمایا کہ میں آج ان کے ہاں کھانا کھاؤں۔ صبوح کو ۱۱ بجے ڈپارٹمنٹ میں جا کر استاذ صاحب سے ملا، جہاں سے لائبریری گئے اور مولانا احسن مرحون مارہروی کا کلیکشن دیکھا۔ اس میں ایک نسخہ ''العروض لیحیی التبریزی'' کا نیز پایا جاتا ہے، لیکن بے ترتیبی کی وجہ سے ہم ان کو دیکھ نہ سکے۔ استاذ صاحب نے فرمایا کہ مصر وغیرہ میں اس کے نسخے پائے جاتے ہیں۔ مولانا احسن مرحوم شاعر

تھے اور کیا شک کہ ان کے یہاں نیز اس کتاب کا نسخہ ہو۔ استاذ صاحب کے گھر گئے، کرم فرما کر بڑا پر تکلف کھانا کھلایا۔ بعد میں بلاذری میں سے کچھ الفاظ میں بیٹھ کر پوچھنے لگا۔ عرجی کا ذکر آیا، استاذ صاحب نے فرمایا: قسطنطنیہ میں، میں نے ان کا دیوان دیکھا ہے۔ اور بعد میں رخصت لے کر کمرے میں پہنچا۔

استاذ صاحب نے فرمایا کہ جوانی میں جب کہ انسان شہرت نہیں حاصل کرتا، اس وقت تک اس کو خدمت کا معاوضہ کم ملتا ہے۔ اس وقت چاہیے کہ وہ فوراً جو کچھ ملے، وہ اپنی جان پر خرچ کردے اور بچانے کا غم نہ پالے۔ تاکہ اس کی صحت وغیرہ ٹھیک رہے۔ جیسے جیسے دن گذرتے جائیں گے اس کی شہرت بڑھتی جائے گی اور معاوضہ بھی زیادہ ملنے لگے گا۔ اس وقت نیز فاضل پیسہ بچانے کی فکر کرے۔ باقی زیادہ تنگی نہ کرے، کیونکہ اس کی عمر اسی لحاظ سے گھٹتی جاتی ہے۔

۵ نومبر ۱۹۴۵ء

آج شام کو استاذ صاحب کی معیت میں قلعے کی طرف گھومنے کا موقع ملا۔ میں نے حریری کی ''درۃ الغواص'' کے متعلق پوچھا، فرمایا کہ حریری نے الفاظ کے عام غلط استعمال کی طرف توجہ دلائی ہے اور ان کا صحیح استعمال دیا ہے۔ فرمایا کہ پڑھنے والا اس کو حریری کی کرامات سمجھے گا، مگر درحقیقت انہوں نے اپنی تحقیق کے علاوہ زیادہ تر دوسری کتابوں سے فائدہ اٹھایا ہے۔ ایک پہلے کی کتاب ''مالحن بہ الناس'' (۱۳۵) سے لیا ہے اور ابن سکیت (۱۳۶) سے لیا ہے اور زیادہ تر ابن قتیبہ کی ''ادب الکاتب'' میں سے لیا ہے۔ جو جو اعتراضات ان پہلی کتابوں پر ہوئے ہیں وہی حریری پر نیز ہو سکتے ہیں۔

فرمایا کہ ''درۃ الغواص'' کی بہترین شرح اور تنقیدیں لکھی گئیں۔ پہلے ابن بری (۱۳۷) اور ابوظفر صقلی (۱۳۸) نے اس پر تشریح و تنقید کی۔ مگر ''درۃ الغواص'' کی بہترین شرح و تنقید شہاب الدین خفاجی (۱۳۹) کی ہے، جس میں انہوں نے اپنے پیش رو کی کتابوں کو نیز سامنے رکھا ہے، کم از کم ابن بری کو تو لیا ہے اور ''درۃ'' پر بہترین فاضلانہ تشریح و تنقید لکھی ہے۔ یہ کتاب اور ''درۃ الغواص'' دونوں مطبع جواب قسطنطنیہ میں چھپ چکے۔ فرمایا کہ اس تیرہویں صدی میں بغداد کے

ایک اور شخص نے ''طرۃ علی درۃ'' (؟) تشریح لکھی ہے لیکن عامی ہے۔

فرمایا کہ ''ادب الکاتب'' کی شرح وتنقید جوالیقی (۱۴۰) اور محمد بن سید البطلیوسی (۱۴۱) نے لکھی، جوالیقی اشعار کی بہتر تشریح کرتا ہے۔ سچ تو یہ ہے کہ بطلیوسی کی شرح فاضلانہ ہے، اور صرف چونکہ وہ اندلس میں رہتے تھے، لہٰذا جوالیقی جو خود عراق کے تھے ان کی زیادہ شہرت ہوگئی۔ فرمایا: بطلیوسی بڑے فاضل تھے۔ ''سقط للمعری'' (۱۴۲) کی شرح خود مصنف سے کہیں بہتر لکھی ہے۔ ''ضرام السقط'' (۱۴۳) اس سے کم پایہ کی شرح ہے۔ ''سقط'' کی شرح خویی نے نیز لکھی تھی۔ جب قاضی ابوبکر ابن العربی مالکی اندلسی بغداد آئے، تو انہوں نے ابوزکریا تبریزی، جو خود معری کے شاگرد تھے۔ ان سے ''سقط الزند'' پڑھی اور اسپین پہنچ کر بطلیوسی کی شرح پر ااعتراضات کیے۔

فرمایا کہ قاضی ابوبکر دینی مسائل کے خواہ کتنے ہی بڑے امام ہوں، تاہم عربیت اور ادب کی رو سے بطلیوسی کو پائے کے ہرگز نہیں پہنچ سکتے۔ فرمایا کہ: بطلیوسی نے قاضی ابوبکر پر رد لکھا، جو دمیاط کے کتب خانے میں موجود ہے، جہاں سے ایک کاتب نے اپنے لیے نسخہ نقل کیا اور اس سے نقل کر کر بیچ ڈالے، فرمایا: میں نے ان سے خود وہی اصلی نسخہ خرید لیا، جو میرے پاس موجود ہے۔ فرمایا کہ اس رد میں نہایت مہذب الفاظ میں، قاضی ابوبکر کے جملہ اعتراضات کو بری طرح رد کر دیا ہے۔ فرمایا کہ قاضی ابوبکر کی تصانیف کو دیکھتے ہوئے ان کی وقعت نظروں میں گر جاتی ہے۔

فرمایا کہ جب قاضی ابوبکر بغداد آئے، اس زمانے میں پیچھے اندلس میں ابن حزم کا مذہب پھیل گیا۔ قاضی ابوبکر نے واپس آکر اس کے خلاف نہایت ناشائستہ الفاظ میں لکھا کہ ''سخیف من مدینۃ فلانہ'' ابن حزم کے متعلق ''سخیف'' کا لفظ ناشائستہ ہے۔ اور کجا ابن حزم، اس کا فضل اور ادب اور کجا قاضی ابوبکر۔ فرمایا کہ قاضی کی کتاب ''العواصم علی القواصم'' جو کہ ایک دینی سفرنامہ ہے، اس میں قاضی ابوبکر کی فاطمیوں وغیرہ سے بحثیں وغیرہ موجود ہیں۔

فرمایا کہ قاضی ابوبکر نے ایک نہایت ردی فقرہ ایک جگہ لکھ دیا ہے کہ ''قتل الحسین

بسیف جدہ''یعنی شریعۃ النبی لانہ خرج علی الإ مام۔فرمایا کہ یہ بہت زیادتی ہے اور اس لیے قاضی ابو بکر کے خلاف کافی لوگوں میں نفرت پھیل گئی، اور خود ابن خلدون نے اپنے مقدمے میں لکھا ہے کہ: قاضی ابوبکر کے فضل کے باوجود یہ فقرہ بے معنی ہے۔

۶ نومبر ۱۹۴۵ء

شام کو استاذ صاحب شہر تشریف لے گئے۔لہٰذا ملاقات نہ ہوسکی۔مغرب کے وقت ان کے دولت خانے پر ملاقات میسر ہوئی۔فرمایا کہ مسلم بن محمود الشیز ری (۱۴۴) ایک ادیب ہو گذرے ہیں اور میں نہیں جانتا کہ دنیا اس کو کما حقہ جانتی ہے۔ پشاور میوزیم میں اس کا رسالہ موجود ہے اور ایک صاحب نے مجھ سے اس کے متعلق دریافت کیا اور میں نے نہایت عجیب وغریب معلومات ان کو دیں۔آج ان کا یہ خط موصول ہوا (میں نے خط پڑھا)

لکھا ہوا تھا کہ: آپ نے اپنے خط میں مجھے مسلم بن محمود الشیز ری کے کلام کا پتا بتلایا تھا۔۔۔ناظم صاحب کتب خانہ رام پور کی مہربانی اور سعی سے بروقت وہ نقل مل گئی۔ان قصائد کے پڑھنے سے معلوم ہوتا ہے کہ مسلم بن محمود نے یہ قصائد ملک المعز اِسماعیل بن سیف الإسلام طغتکین کی مدح میں کہے ہیں جس کے لیے اس نے ''عجائب الاسفار'' (۱۴۵) لکھی تھی، نہ کہ الناصر لدین اللہ (خلیفہ بغداد) کی مدح میں۔ممکن ہے کہ رامپور والی کتاب کے باقی قصائد الناصر لدین اللہ کی مدح میں ہوں۔مسلم بن محمود کے قصائد الملک المعز طغتکین کی مدح میں ہیں، جن کا علم محض آپ کی مہربانی اور اطلاع سے مجھے ہوا ہے اور آپ کی اس عنایت کے شکریے کے طور پر یہ عریضہ ارسال خدمت ہے۔امید ہے کہ آئندہ بھی اس سلسلے میں بندے کو ہدایت فرماتے رہیں گے۔خاکسار احمد حسن لائبریرین اسلامیہ کالج پشاور)

استاذ صاحب نے فرمایا کہ میں نے ان کو لکھا ہے کہ آپ علی گڑھ تشریف لائیں، تا کہ میں آپ کو اس رسالے کی مکمل تصحیح کر دوں اور باقی معلومات میں اضافہ کر دوں۔

مارچ ۱۹۴۶ء

تاریخ ۱۳ مارچ ۱۹۴۶ء کو کراچی سے علی گڑھ ریسرچ کے سلسلے میں آنا ہوا۔

استاذ صاحب کی کوٹھی پر قیام ہوا ہے۔ کرم فرما کر مشرقی کمرہ خالی کر دیا۔ پہلے دن کی ضیافت فرمائی۔ تقریباً ۱۸ مارچ کو نقوی پارک ٹہلنے گئے۔ قرآن شریف کے انڈیکس کے متعلق گفتگو ہوئی۔ فرمایا: اورنگزیب کے زمانے میں فہرست بنائی گئی تھی۔ فرمایا کہ بنارس کے ایک پادری نے سب حروف کو تہجی پر مرتب کر دیا ہے، جو غیر عالم کے لیے کافی مفید ہے۔ فرمایا کہ ترکی میں نیز ایک فہرست (مجھے اس کی تفصیل اور نام یاد نہیں رہا۔ نبی بخش) بنائی گئی۔ فرمایا کہ لیکن سب سے بہتر فہرست ''فتح الرحمٰن فی آیات القرآن'' ہے، جو فلسطین کے ایک شخص نے بنائی ہے اور ہر ایک لفظ کے آگے پیچھے والے ایک دو الفاظ ضبط کر کے آیات کو مقید کر دیا ہے۔ فرمایا کہ باریک پیپر پر نہایت خوبصورتی سے چھپی ہے۔ فرمایا کہ فلوگل نے بھی بڑا کام کیا ہے اور کافی جان لڑا کر فہرست قرآن بنائی ہے۔

<u>۲۴ فروری ۱۹۴۶ء</u>

استاذ صاحب کو خاندانی حالات (جاہل بھائیوں کی غیر منصفانہ روش، اپنی زوجہ کی خواہ مخواہ لڑائیاں) نے کافی ستایا ہے۔ سب قصے سنائے۔ فرمایا کہ یہ باتیں اگر اندر میں رکھی جائیں تو انسان گھل گھل کر مر جاتا ہے۔ آپ چونکہ رازداں ہیں، لہٰذا میں آپ سے بیان کرتا ہوں کہ کس طرح والد صاحب نے دوسرے بھائیوں کے قبضے میں آکر قطع تعلقات کر رکھا ہے۔ ابھی ابھی ان کی بیماری کی اطلاع ملی تو بہت افسوس ہوا۔ میں ان کو خط لکھنے والا ہوں۔ فرمایا کہ ان کی اس روش سے حیاتی کم ہوتی جا رہی ہے۔

فرمایا کہ ۱۸۔۱۹ برس کی عمر میں والد صاحب نے اصرار کر کے میری شادی کرائی۔ میرے انکار در انکار کا ان پر کچھ اثر نہیں ہوا۔ شادی میرے تایا جان کے گھر سے ہوئی۔ بعد میں والد صاحب کی تایا جان سے لڑائی ہوگئی تو مجھے کہا کہ آپ طلاق دے دو۔ میں نے پھر سمجھایا کہ: پہلے تو آپ نے میری مرضی کے خلاف شادی کرائی۔ اب اس فعل کو میں بہتر نہیں سمجھتا اس کہنے پر بہت بگڑ گئے، اس حد تک کہ مجھے طلاق ہی دینی پڑی اور ساتھ یہ عہد کیا کہ آئندہ میں کبھی شادی نہیں کروں گا۔ اس کے بعد پھر والد صاحب نے اس سلسلے میں میری جان چھوڑ دی۔ مگر قیام

پشاور کے زمانے میں کئی قسم کے امراض پیدا ہو گئے۔ حکیموں نے شادی کا مشورہ دیا۔ میں نے نہ مانا۔ لیکن حالت اتنی خراب ہوگئی کہ چاروناچار شادی کرنی پڑی۔ جس سے کئی جنجال پیدا ہو گئے۔ فرمایا کہ: اگر مجھے گھر میں سکون نصیب ہوا ہوتا، تو دنیا میری خدمات سے بہت کچھ مستفید ہوتی۔

استاذ صاحب نے پروفیسر زبید احمد صاحب کی کتاب ''عربی لٹریچر'' دی اور فرمایا کہ اس میں سے حسن صاغانی کی حالات پڑھو۔ پڑھ کر سنائے۔ فرمایا کہ یہ وہی معلومات ہیں جو سب کو معلوم ہیں۔ مصنف نے خاص معلومات کا ذکر نہیں کیا۔ فرمایا: تاہم مصنف نے بڑی محنت سے کام کیا ہے اور یہ کتاب اہم ہے۔ شہاب خفاجی کے متعلق فرمایا کہ ''خزانۃ الادب'' کے مصنف کے استاذ تھے۔ فرمایا کہ میں نے حسن صاغانی کی ۹ تصانیف تقریباً سب کی سب ان کے ہاتھ کی لکھی ہوئی دیکھی ہیں۔

فرمایا: مصر کے ایک عالم نے وزیر بہاء الدین جونا گڑھی کے نام ایک کتاب منسوب کی تھی اور چند اشعار کے ساتھ وہ کتاب وزیر کو بھیج دی تھی۔ ان اشعار میں سے اخیر کا ایک مصرع یوں ہے کہ:

''تعیش بهائو الدین فی عزجونکره''

شہاب الدین دولت آبادی (۱۴۶) کی کتاب ''ارشاد فی النحو'' کا ذکر کیا۔ استاذ صاحب نے فرمایا کہ اس میں یہ خوبی ہے کہ وہ مثالوں میں نحوی معنی کا استعمال دے دیتا ہے۔ فرمایا کہ اس کی کتاب ''مواج'' (۱۴۷) میرے ہاں موجود ہے۔

استاذ صاحب نے فرمایا کہ شہاب الدین دولت آبادی کی کتاب '' الہندی شرح الکافیہ'' کا نسخہ میرے پاس موجود ہے۔ فرمایا ملا جامی کی شرح اسی ''شرح الہندی'' سے لی گئی ہے۔

صبح کو ٹہلنے گئے، جیسا کہ یہاں آتے ہی ہر روز صبح کو استاذ صاحب نیند سے جگاتے ہیں اور سیر کے لیے قلعے کی طرف جاتے ہیں۔ استاذ صاحب نے فرمایا کہ یہ صبح کا سیر حیاتی کو دراز کرنے والا ہے۔ فرمایا کہ انسان اگر کسی کام کا ارادہ کر لے، تو یہ سیر کا وقت تضیع اوقات ہرگز

ہرگز نہیں۔

۲۸ مارچ ۱۹۴۶ء

شام کو نقوی پارک میں استاذ صاحب کی معیت میں ٹہلنے گئے۔ عربی کتابوں کی تجارت کے متعلق گفتگو رہی۔ فرمایا کہ: ہندوستان میں عبدالستار السورتی سب سے اولی العزم تاجر ہے۔ فرمایا کہ اچھے مکتب کے لیے کم از کم ایک لاکھ روپے کے سرمایے کی ضرورت ہے۔ فرمایا: قرش دو آنہ ایک پائی کے برابر ہوتا ہے، مصری پونڈ ایک سو قرش کے برابر ہے اور انگریزی پونڈ ساڑھے ستانوے قرش کے۔ فرمایا کہ سفید پیپر پر مصر کی نئی تازی چھپی ہوئی کتاب، جو دو سو سے تین سو صفحے تک ہو، اس کی قیمت دس سے لے کر پندرہ پونڈ تک ہوتی ہے۔ یہ ایک عام اصول ہے اور آپ یاد رکھیں۔ فرمایا کہ اگر کوئی آدمی تجارت کرے تو ایک سال میں کم از کم دو تین مہینے کے لیے مصر جائے۔ وہاں صنادقیہ محلے میں کتابیں نہایت سستے داموں میں مل جاتی ہیں۔

۲۷ مارچ ۱۹۴۶ء

استاذ صاحب نے امرؤالقیس کا شعر پڑھا:

رُبَّ رَامٍ من بنی ثُعَلٍ
مُتْلِجٍ كَفَّيْهِ فی قترہ

میری استدعا پر یہ شعر میری ڈائری میں اپنے قلم سے لکھا

استاذ صاحب سے مندرجہ ذیل بیت کے معنی پوچھے:

لکیز لها البحران والسیف کله
وان یاتها باس مـن الهند كارب

فرمایا کہ یہ ابیات بہت مشہور ہیں اور ''مفضلیات''، ''دیوان حماسہ'' اور میری کتاب ''السمط'' میں آپ کو مل جائیں گے۔ میں نے اِن قبلِ اسلام اشعار کی قدامت کے متعلق استفسار کیا، تو فرمایا کہ اکثر اشعار جاہلیہ، نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی ولادت کے زمانے کے لگ بھگ کے ہیں۔ فرمایا کہ ابن قتیبہ (۱۴۸) نے ''معارف'' میں لکھا ہے: یہ اشعار اسلام سے پچاس برس قبل

تک جاتے ہیں۔

فرمایا کہ اس میں کوئی شک نہیں کہ کچھ شعراء پرانے ہیں اور اَفْوَہ الأودی(۱۴۹) کے متعلق تو کہا جاتا ہے کہ مسیح کے زمانے کا ہے۔فرمایا: مگر ان اشعار کو زیادہ قدیم سمجھنا قرین قیاس نہیں۔ کیونکہ امرؤالقیس قدیم شعراء میں مانا جاتا ہے، تاہم اس کی قدامت کا یہ حال ہے کہ اس نے ایک تیرانداز کا ذکر اپنے اشعار میں کیا ہے جس نے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کا زمانہ پایا اور صحابہ میں سے تھا۔ یہ بنی ثعل قبیلے کا شخص تھا۔ اس کے حالات ''اِصابہ'' میں مل جائیں گے۔

امرؤالقیس والا اوپر لکھا ہوا شعر پڑھا۔ اور پھر میری گذارش پر اپنے ہاتھ سے تحریر فرمایا)

<u>۳۱ مارچ ۱۹۴۶ء</u>

استاذ صاحب نے اوپر کا حوالہ ''کتاب المعارف'' لابن قتیبہ میں سے نکال دیا۔ یوں ہے

عمرو بن المسیح الطائی رضی الله عنه، وفد إلی النبی صلی الله علیه وسلم، وکان أرمی العرب کلها وهو الذی یقول فیه امرؤالقیس: رب رام من بنی ثعل، مخرج کفیه من ستره [کذا] وعاش مائة وخمسین سنة۔ ولست أدری أقبض قبل وفاة النبی صلی الله علیه وسلم ام بعده (۱۵۰)۔ المعارف ص: ۱۶۰

<u>۲۔اپریل ۱۹۴۶ء</u>

کل مسٹر فیضی پرنسپل لاء کالج بمبئی نے استاذ صاحب کو ایک خط لکھا کہ ''دعائم الاسلام'' للقاضی النعمان کو ایڈٹ کر رہے ہیں، کہیں حدیث علی میں ایک لفظ ''العتکل، العسکل، العنیکل وغیرہ صورتوں میں آیا ہے جس کا کچھ بھی مطلب نہیں بنتا۔ لہٰذا استاذ اس پر روشنی ڈالیں۔ آخر میں لکھا تھا کہ آپ ایک بحر ذخار ہیں۔ اور افسوس کہ ہمیں آپ کے علم سے مستفید ہونے کا موقع نہیں ملتا وغیرہ۔ کل شام استاذ صاحب نے وہ خط دکھایا تھا۔ آج صبح کو کارڈ پر اس کا جواب

لکھا۔ جو نقل کیا جاتا ہے۔

۲۔اپریل ۱۹۴۶ء

صديقى الأستاذ الفاضل أكرمكم الله بتقواه

وعليكم السلام ورحمة الله ورضوانه

وصلنى الكتاب الكريم فحمدت الله على السلامة والعافية ودعوته أن يديمهما عليكم آناء الأسحار والآصال

وأما ما سالتكم فإنها تحريفة أوقعتكم فى إتعاب، ليست الا، ما هو إلا "الفسكل" وهو آخر أفراس حلبة الرهان، ويسمى السكيت ايضا (پھسڈی) وفى الحديث على ما فى النهايه ومجمع البحار والتاج: أن أسماء بنت عميس قالت لعلى: ان ثلاثة أنت آخر هم الأخيار، فقال على لا ولأدها: قد فَسْكَلْتِنى ابكم أى أخرتنى وجعلتنى كالفسكل۔ وكانت تزوجت قبله بجعفر أخيه ثم بأبى بكر الصديق بعد جعفر ۔ا۔ھ ،واما حديث "دعائم الاسلام" فكم من أحاديث مرفوعة عن أهل السنة فى مثل معناه ۔والرجاء أنى قد قضيت حاجتكم ولم يبق مجال فيها للووليت، والسلام فى الختام(۱۵۱)

من الداعى

عبدالعزيز الميمنى جامعة على گره

على يوم من الايام الماضيه (کسی گذشتہ روز)

میرے یہاں پہنچنے پر ایک دن مرحوم حافظ محمود شیرانی کی وفات کا ذکر آیا۔ استاذ صاحب نے فرمایا کہ افسوس کہ ہندوستان کے ایک بڑے فاضل جہان سے چل بسے۔ فارسی اور

اردو پر بڑا عبور تھا اور معلوم ہوتا ہے کہ انہوں نے کتابوں کا ایک بڑا ذخیرہ جمع کر رکھا تھا۔

ابھی ابھی پانچ روز کا ذکر ہے کہ مولانا راغب صاحب نے مولانا سید طفیل احمد صاحب کی وفات کی خبر سنائی۔ انا للہ وانا الیہ راجعون۔ مولانا طفیل احمد صاحب ۳۰ مارچ ۱۹۴۶ء کو وفات فرما گئے۔ استاذ صاحب کو بہت افسوس ہوا۔ کہا کہ ''بلوچ صاحب! اپنے رفقاء واحباب کے چل بسنے پر دل کو بہت بڑا صدمہ پہنچتا ہے۔''

[بندہ کی نیز مولانا طفیل احمد صاحب سے علی گڑھ میں گاہے بگاہے ملاقات رہی اور وہ اکثر میری ریسرچ کے متعلق دریافت فرمایا کرتے تھے۔ میں نے ان سے ان کی قابل قدر کتاب ''مسلمانوں کا روشن مستقبل'' کو سندھی زبان میں ترجمہ کرنے کی اجازت مانگی تھی، جو انہوں نے خندہ پیشانی سے بڑی خوشی کے ساتھ دی۔ حقیقت ہے کہ مولانا طفیل احمد صاحب نہایت خلیق اور پابند شرع و نیک نیت فاضل تھے۔ اللہ ان پر رحمت فرمائے]

۶۔ اپریل ۱۹۴۶ء

آج صبح کو حسب دستور استاذ صاحب کے ساتھ قلعے کی طرف سیر کو جانا ہوا۔ فرمایا کہ ''ہندوؤں کو پیسے پر گھمنڈ ہے اور اپنے سرمایے کے زور پر مسلمانوں کو خاطر میں نہیں لاتے، اور مسلمانوں کو پیسے سنبھالنے کا ڈھنگ نہیں، اور دنیا میں مسافروں کی سی زندگی بسر کرنے کے عادی نہیں۔ پچھلے زمانے میں سپاہ گری پر ان کا دارومدار تھا۔ اب وہ تو ہاتھ میں ہی نہیں۔ غالب کا شعر پڑھا کہ: ''سو سال سے پیشہ آبا سپہ گری''

اس پر میں نے عرض کیا کہ آج کل ایک گروہ ایسا ہے، جو غالب کی شاعری کا منکر ہے۔ وہ تو میر ہی کو مانتے ہیں۔ فرمایا کہ اس میں کوئی شک نہیں کہ میر غالب سے پہلے تھا اور خود غالب کو میر کا اعتراف ہے اور یہ بیت پڑھا۔

غالب اپنا یہ عقیدہ ہے بقول ناسخ
آپ بے بہرہ ہے جو معتقد میر نہیں

بعد میں کہا کہ ''جو غالب کو شاعر نہیں مانتے، وہ خود لاشی ہیں۔ غالب نے اردو زبان کو

ایک خاص اسلوب وقالب دیا، جو آج تک مروج ہے۔ البتہ ان کے ہاں آج کل کے انگریزی اصطلاحات سے نقل شدہ فقرے مثلاً میں پانی پی سکتا ہوں ''Can I drink'' نہیں ملتے۔ فرمایا: یہ اصطلاحات بالکل فضول ہیں۔ ان سے پوچھو کہ اگر آپ کے ہاتھ میں سکت ہے اور پانی آپ کے حلق سے نیچے اتر سکتا ہے، تو آپ پی سکتے ہیں۔ اس میں پوچھنے کی کیا گنجائش ہے۔ فرمایا کہ کہنا یوں چاہیے کہ مجھے پانی پینے کی اجازت ہے وغیرہ۔ فرمایا: غالب نے اردو کو موجودہ رنگ دیا، البتہ ان کے اشعار میں فارسی محاورات کے استعمال سے تکلف پیدا ہو گیا ہے۔ تاہم غالب کا شعر خیالات کی گہرائی، الفاظ کی بندش اور ترکیب میں بے مثال ہے، گو ان کے شعر میں وہ نازک بیانی جو کہیں کہیں ذوق کے اشعار میں پائی جاتی ہے نہیں۔

فرمایا کہ اپنے اسلوب کے اختراع کی وجہ سے غالب کی زبان میں لچک کی گنجائش نہیں، اور وہ خوبی جو داغ، امیر مینائی اینڈ کو کی زبان میں پائی جاتی ہے، وہ اُن کے ہاں نہیں۔ لیکن یہ ایک فطری بات ہے کہ ایک خوبی جو ایک شاعر میں ہے، وہ دوسرے میں نہیں۔ اور اس بناء پر کسی شاعر کی قدر و قیمت کو گرانا مناسب نہیں۔ اس کے بعد غالب کی یہ غزل مکمل پڑھی:

مدت ہوئی ہے یار کو مہماں کیے ہوئے

فرمایا: دیکھیے۔ یہ زبان ہے یا ساحری! اور پھر یہ غزل پوری پڑھی

وہ اپنی خو نہ بدلیں گے، ہم اپنی وضع کیوں بدلیں

سب سر بن کے کیا پوچھیں کہ ہم سے سرگراں کیوں ہو

فرمایا کہ میں نے دونوں رنگ دیکھے ہیں اور سمجھتا ہوں کہ اردو زبان میں غالب کی وقعت، عربی زبان میں متنبی سے زیادہ ہے۔ فرمایا: متنبی کو عربی ادب سے ہٹا لیجیے۔ کوئی فرق نہیں آئے گا۔ لیکن غالب کو اردو زبان سے ہٹانے پر زبان کی پوری عمارت زمین پر آن پڑے گی۔ بعد میں زبان اور معنی کی روء سے شعر پر روشنی ڈالتے ہوئے فرمایا کہ:

عربی میں ابن ھانی کا دیوان بعض خوبیوں کی وجہ سے متنبی سے بہتر ہے، فرمایا: مثلاً ابن ھانی (۱۵۲) کا دیوان (۱۵۳) آپ پورا پڑھتے جائیں، بغیر معنی پر توجہ کرتے ہوئے، تو

بہترین دیوان معلوم ہوگا۔ اس کے بعد فرمایا کہ ابن ھانی کے دو قصیدے واقعی لاجواب ہیں اور قصیدہ نونیہ اور فائیہ (جس میں ستاروں کا بیان ہے) پڑھے۔ نونیہ کے کچھ اشعار پڑھے اور فرمایا: دیکھیے کہ زبان پر کیا ملکہ ہے، لیکن از روءِ معنی گوزشتر ہیں۔ نونیہ کے شروع کے اشعار پڑھے اور ان کی خوبصورتی بتائی اور فرمایا کہ اس طرح کہیں کہیں بہترین معنی بھی مل جاتے ہیں۔ اس کے بعد فائیہ پڑھا اور ستاروں کے معانی کا ذکر کیا۔ فرمایا کہ ابن ھانی نے مُعز (۱۵۴) کی مدح میں استغراق کی وجہ سے اپنی شاعری کو ملوث کر دیا، اور علماء نے اس کو پڑھنا مناسب نہ سمجھا، اس لیے ان کا دیوان مروج نہیں ہوا۔

<u>۸۔ اپریل ۱۹۴۶ء</u>

صبح کی سیر میں استاذ صاحب نے فرمایا کہ میں تکلف کو بالکل ناپسند کرتا ہوں کیوں، کہ تکلف کی وجہ سے انسان اپنے جوہر انسانیت کو کھو بیٹھتا ہے۔ اور زندگی کے اصل مقصد سے ہٹ کر فضولیات میں پڑ جاتا ہے۔

شام کو بمبئی سے فیضی صاحب کا جوابی خط آیا

جناب مکرم علامہ المیمنی صاحب، السلام علیک، آپ کا جواب واقعی تشفی کن ہے، کسی شخص نے یہ اصلاح نہیں کی۔ لیکن خیال ہوتا ہے کہ عبارت کو ''کالفسکل'' پڑھنا چاہیے۔ عبارت کی حیثیت سے آپ اصلاح کیسے دیں گے۔ والسلام

جائی استاذ ہمیشہ خالی است!

خاکسار

آصف فیضی

<u>۱۲۔ اپریل ۱۹۴۶ء</u>

سیدنا طاہر سیف الدین پیر بواہرہ پرسوں یونیورسٹی میں آئے اور میڈیکل کالج کو ایک لاکھ روپیہ کا عطیہ دیا۔ آج ان کے عامل احمد علی صاحب، میمن صاحب کے ہاں آئے اور ملا

صاحب کی مطبوعات پیش کیں اور نیز ۵۰ روپے ملا صاحب کی طرف سے پیش کیے۔ استاذ صاحب نے بتایا کہ کس طرح یہ دوسروں کو اپنی طرف کھینچنے کی تدابیر کیا کرتے ہیں۔

۱۷۔اپریل ۱۹۴۶ء

آج ڈاکٹر زاہد علی صاحب ریٹائرڈ پروفیسر عربی نظام کالج، استاذ صاحب کے بنگلے پر تشریف لائے۔شام کو ڈاکٹر یوسف صاحب کے مصر جانے پر سال دوم کے طلبہ نے چائے کی دعوت کی تھی۔استاذ صاحب نے ان کی طرف سے بندہ کو نیز دعوت دی۔ڈاکٹر زاہد علی نیز شریک رہے۔ایک طالب علم عزیز صاحب نے یوسف صاحب کی وداع کے متعلق شعر پڑھا جس میں ایک مصرع یہ تھا کہ مصر! تیری یہ عجیب خوش قسمتی ہے کہ ''ملے یوسف تجھے ہندوستان سے'' استاذ صاحب نے یوسف صاحب کے اوصاف حمیدہ پر وافر تبصرہ کیا۔ایک خاص بات یوسف صاحب کی ذہانت کے متعلق یہ فرمائی، جو پوری تعریف کا لب لباب ہے کہ ''یوسف صاحب کا دماغ غلطی کی طرف جاتا ہی نہیں'' یوسف صاحب نے استاذ صاحب کا ذکر کیا اور ایک نہایت گہری حقیقت کا اظہار ان الفاظ میں کیا کہ:

''استاذ صاحب سراپا علم ہیں۔اگر لوگ ان میں علم کے علاوہ دوسری چیزیں ڈھونڈنے کی کوشش کرتے ہیں، تو ان کو نہیں ملیں گی۔''

۱۸۔اپریل ۱۹۴۶ء

ڈاکٹر زاہد علی صاحب ابو حاتم الرازی کی ''کتاب الزینہ فی غریب القرآن والحدیث'' ایڈٹ کرنے کا ارادہ رکھتے ہیں۔کتاب کی نقل ساتھ لائے ہیں اور استاذ صاحب سے ابیات کی تخریج کے متعلق پوچھنا چاہتے تھے۔استاذ صاحب نے تقریباً اکثر اشعار دیکھے ہیں، ان کا نہ صرف پتا دیا، بلکہ ہمارے سامنے ان ابیات کے پہلے پچھلے اشعار، حافظے سے پڑھ کر سنائے۔ڈاکٹر زاہد علی یہ دیکھ کر عش عش کرنے لگے اور سر دھنتے رہے۔فرمایا کہ آپ زندہ کتاب ہیں۔

ڈاکٹر زاہد علی نے اپنی ایک نفیس مخطوطہ تصنیف المسمی بہ ''ہمارے اسماعیلی مذہب کی حقیقت اور اس کا نظام'' دکھائی، جس میں دعوت کی کتابوں سے ہی استدلال کرکے، اس مذہب

کے ہر پہلو پر روشنی ڈالی ہے، اور ایک تاریک باب کو روشن کر دیا ہے۔ یہ تصنیف نہایت نفیس اور بے نظیر ہے اور مصنف کی مسلسل کوشش اور گہری نظر کا پتا دیتی ہے۔ اور مصنف نے اس کو نیک نیتی سے اور انصاف سے لکھا ہے۔ یہ ایک ''گھر کا پول'' ہے جو کھل جاتا ہے، لیکن یہ اہم علمی تحقیق ہے اور اسماعیلی دعوت کے متعلق دنیا کی آنکھیں کھول دینے والی ہے۔

۲۰۔ اپریل ۱۹۴۶ء

استاذ صاحب نے ''حماسۃ البحتری'' (۱۵۵)، الاب شیخو کا مطبوعہ کھول کر دکھایا کہ کس طرح اس احمق نے اصلی صحیح نسخے کو اپنی حماقت کی وجہ سے بگاڑ ڈالا اور پھر دوسرے نسخے کی قرائات کی کتاب کھڑی کر کے، ان اغلاط کی تصحیح کا سہرا اپنے سر پر لینا چاہا۔ اس طرح کہ ان اغلاط کو اصلی نسخے کی طرف منسوب کرنا چاہا۔ حالانکہ ھوالذی غلط۔ الصواب فی النسخۃ الأصلیۃ

''کتاب الزینۃ'' تصنیف احمد بن حمدان أبی حاتم الرازی (۱۵۶)، نسخہ ڈاکٹر زاہد علی ص: ۱۱۸ سے، مصنف کی فارسی شاعری کی اہمیت واضح کی اور فرمایا کہ اسے نقل کر دیجیے۔ اور ساتھ ہی دیوان ابی تمام میں سے ان کے اشعار نکال کر دکھائے جو اس نے ابریشہر میں ایک فارسی رقاصہ کو گاتے ہوئے سن کر کہے تھے۔

اقتباس از کتاب الزینۃ جو استاذ صاحب کے لیے نیز نقل کیا گیا

ونقول انا لم نجد لسائر الأمم شعرا كما وجدنا للعرب موزونا مقوما، والذى قالته العجم فى الأغانى هو بين الشعر والكلام المنثور وليس له وزن الشعر العربى ولا تقويمه، بل هو كلام قد تسجعوه ومثلوه بالألحان وطربوا فى إبرازه ومددوا القول به وليس على وزن الشعر وإقرائه. إنما هو تطريب وتشويق، ليس فيه مدح ولا هجاء ولا افتخار، ولا فيه ذكر الحرب والوقائع وتقييد الأنساب ونشر /۱۲۸ الأحساب والمآثر والمناقب والمثالب وصفات الخيل والإبل والوحش والفيافى والرياح والأمطار والنجع وغير ذلك مما جاء فى الشعر، ويطول الشرح به والدليل على أن الشاعر لا يوجد له اسم

بـالـفـارسية وكـذلـك الشعر لا اسم له الا بالعربية فقد كان الأعشى وفد على كسرى فسأل عنه فقالوا۔ ''سرود گوبتازی''يعنون بالعربية فأنشد

أرقت وما هذا الشهاد المورق

ومــابى من سقم ومابى معشق

وفســر لـه قـولـه، فـقـال: اذا هـولص ولم يعلم انه/ ۱۲۹ قد يأرق غير السـقـيـم والـعـاشـق والـلـص، وهـو مـلـك، فاين ما يلحق الملوك من السهر لتـفـكـرهم فى أمر المملكة والتدبير۔ والمهموم أشد سهرا من السقيم وغيره، الـمـذعور اشد سهرا منه۔ ومن أجل ذلك اتخذت الملوك سمارا ومحدثين حتـى رويـت عـنهـم الأسـمـار..... والسـمـر حـديث الليل..... عنـه السهر، ولـلسهـر أسباب كثيره غفل عنها هذا العلج ،وخفيت عليه۔ وإنما قيل له حين سـأل عـن الأعشى ''سرود گو بتازى ''لانهم لم يوفوا للشاعر اسما، ولا عرفوا الشـعـر، ولم يكن فيهم ديوان الشعر۔ واما الذى أحد ثوه الآن/ ۱۳۰ من الشعر بـالفارسية فهو كلام لا معنى له ولا حجة فيه ولا نفع به ولا ديوان له عند العجم مثـل ديـوان الشـعـر عند العرب وكما فيه من النفع الظاهر والفضل البين۔ وهو شـىء مـحـدث، غيـر قـديـم، سمعوا الشعر العربى فتكلفوه حذوه على ذلك الـمثـال۔ سـمـعـت جـمـاعة مـن أهـل الـمـعـرفة يذكـرون: أن اول من قـال الشعربالفارسيه رجل من أهل نيسابور، منذ زمن قريب۔ فاما القديم من الأغانى بـالفارسيه، فهو كلام غير موزون ولا محذو على القوافى، على نحو ما وصفنا۔ وانـمـا معنى قولهم لكسرى''سرود گوبتازی''معناه: مغن بالعربية ،والغناء غير الشـعـر وهـو اسـم عـلـى الانـفـراد، وإنـمـا يسـمـى منه غناء ما كان فى الرقيق والتشبيـب بالنساء ويقصد به ذلك المعنى فقط۔ والذى يُشبهه من الشعر مثل قول جرير

إِنَّ الْعُيُوْنَ الَّتِيْ فِي طَرفِهَا حَوَرٌ
قَتَلْنَنَا ثُمَّ لَمْ يُحْيِيْن قَتْلانَا

والشعر فنون كثيرة غير الغناء، كما ذكرنا من مذاهب العرب فى المدح والهجاء وغير ذلک من الصفات الكثيرة فى التحريض على السعى فى أمر المعاد والتقديم فى فعل الخير واصطناع المعروف وتجنب الآثام وما يكون فيه هتک /۱۳۲ على رئوس الأشهاد، اذا كشف الغطاء وظهرت الأعمال كقول لبيد:

وكل امرِئ يوما سيعلم سعيه
اذا كشفت عند الإله الحصائل

فهذا بعيد من معنى الغناء الذى هو تحريض على التقحيم فى الآثام، وقلة المبالاه بارتكاب المحارم والتهتک فيه والحض على الانهماک فيه كقول القائل:

إذا أنت لم تطرب ولم تشهدِ الغنا
فكن حجرا من يابس الصخر جلمدا

فهذا وما أشبهه يجوز أن يسمى غناء، فأما ما سوى ذلک فليس بغناء ولا يجوز أن يسمى باسمه /۱۳۳ ۔فإن الملوک والنبلاء من الناس والصالحين قد أنشدوا الشعر وقالوه ويجوز أن يعرفوا ذلک وهو أدب لهم ورفعة لمنزلهم إذ عرفوه۔ ولا يجوز أن يقال إذا أنشدوا الشعر وقالوه فلان معن أو قد غنى۔ ويقول (كذا،يقال؟) فى هذا القول تهجين له أو وضع منه۔ والفرق بين الشعر والغناء بين۔ وقائل الشعر ومنشده بعيد من صفة المغنى رفيع الدرجة عن خامة المغنين وسقوط منزلتهم عند أهل الفضل وذوى الألباب/۱۳۴ ۔

فرس کے غناء کی دلآویزی کے سلسلے میں استاذ صاحب نے ابوتمام کے یہ اشعار حافظے

سے پڑھے اور پھر دیوان میں دکھائے۔

وقال وقد سمع مغنية تغني بالفارسية، فاستحسن الصوت ولم يعرف المعنى

أيـا سَـهَرِى بِبلدةِ أبر شَهَر — زَمَـمْـت إلـيّ في نَوْمِي سِوَاها
شكرتُك ليلةً حَسُنَتْ وَطَابَتْ — أَقَامَ سُرُوْرَهَا وَمَضٰى كَرَاها
ومـا سُهُـرٌ بـمـحـمـود ولكن — قَـضـى حاجاتِ نفسي مَا قضاها
إذا وَهَـدَاتُ إرضٍ كـانَ فِيها — هَـوَاكَ فَلا تـحـنّ إلـى رُبَاها
سَـمِعْـتُ بهـا غِـنَـاءً كان أولى — بـأن يَـقْتَـادَ نَـفْسِـى مِـن غناها
ومُسْـمِعْةٍ يَّـحَـارُ السَّمْعُ فِيْهَا — وَلَـمْ تَصْـمـه لا يَصْـمِم صَـداها
مَـرَت أوتـارها فَشَفَتْ وشَاقَت — ولـو يَسْـطِيْـعُ حَـاسِدُها فداها
فما خلت الخُدودُ كَسَبْنَ شَوْقًا — لِـقَـلْـبِـى مِثْـلَ مَا كَسَبَتْ يَدَاها
ولـم أفهـم مـعـانيهـا ولـكـن — دَرَتْ كَبَـدِىْ فَلم أَجْهَلْ شَجَاها
فَبِـتُّ كَـأَنَّـنِـى أَعْـمٰـى مُعَنًّى — يُـحِـبُّ الْـغَـانِيَـاتِ وَمَـا يَراهـا

(دیوان، طبع بیروت: ۱۸۸۹)

۲۲۔اپریل ۱۹۴۶ء

عربی سوسائٹی کی طرف سے ڈاکٹر یوسف صاحب کی الوداعی پارٹی آفتاب ہوسٹل میں ہوئی۔ گروپ فوٹو کا بھی انتظام تھا۔ استاذ صاحب نے مدعو کیا، ساتھ ہی گئے۔ ڈاکٹر زاہد علی صاحب نیز شریک تھے۔ کھانے کے بعد پہلے سید ہادی عطا سال چہارم کے طالب العلم نے اپنا خطاب عربی میں کیا، جو وہ لکھ کر لائے تھے۔ لیکن بہت صحیح اور موزوں عبارت میں تھا۔

استاذ صاحب نے اپنی صدارتی تقریر میں پہلے عربی میں برجستہ جواب دیا۔ اور پھر اردو میں تقریر فرماتے ہوئے سید ہادی عطا کی قدر کی اور فرمایا کہ ان کو جواب دینا عربی میں ضروری تھا۔ لہٰذا عربی میں خطاب کیا۔ دوسرے طلبہ کو نیز استاذ صاحب نے ہمت دلائی کہ وہ اس

سلسلے میں آگے بڑھیں۔استاذ صاحب نے پھر یوسف صاحب کی لیاقت کا ذکر کیا اور مثال دی کہ کس طرح مصر والوں نے بغداد سے امام ۔۔۔المالکی کو بلایا تھا اور پورا بغداد ان کو الوداع کرنے کو آیا آخر میں یوسف صاحب کی روانگی کے سلسلے میں استاذ صاحب نے شعر پڑھا کہ

ھیہات ۔۔۔(شعر درج نہیں ہوسکا)

۲۵۔اپریل ۱۹۴۶ء

حسبِ معمول صبح کو قلعے کی طرف گھومنے گئے اور معمولی ورزش کی، جو روزانہ درمیانی پل پر جا کر کرتے ہیں۔استاذ صاحب نے فرمایا کہ: اس طرح ہم اس مشین کو کچھ درست کرتے ہیں، تاکہ دن بھر کام دے سکے۔پھر فرمایا کہ بلوچ صاحب پرانے علماء اور ہمارے درمیان بڑا فرق ہے، وہ زندگی کے دوسرے رنگ پر تھے۔اس کا سبب یہی تھا کہ ان کو افکار زندگی کم تھے اور اتنا تشتت بال بھی نہ تھا۔اس وقت اسلامی حکومت تھی اور آج کل یورپی قومیں لوگوں کے سروں پر چڑھ آئی ہیں اور جینا مشکل کر دیا ہے، پھر اس زمانے میں علم کے پھلنے پھولنے کی بڑی وجہ یہ تھی کہ پوری سوسائٹی کا یہی رنگ تھا۔مساجد میں نوجوان بیٹھتے تھے تو علم کا تذکرہ ہوا کرتا تھا۔فضلاء و وزراء اور امراء کی محفلوں میں علمی مباحث ہوا کرتے تھے۔دوسرا یہ کہ علم حاصل کرنے اور اس کو ترقی دینے کے وسائل موجود تھے۔

خطیب بغدادی (۱۵۷) نے لکھا ہے کہ ابوعبیداللہ المرزبانی (۱۵۸) کے ہاں ستر، اسی لحاف زائد ہوا کرتے تھے اور ہم رات کو علمی مجلس کے بعد وہیں سو جایا کرتے تھے۔فرمایا کہ: بغدادی غریب لوگوں میں سے تھا۔فرمایا کہ بہاء الدولہ کے وزیر سابور بن اردشیر نے بغداد میں بین السورین ایک دارالکتب القدیمہ بنایا تھا، جس میں قدیم اساتذہ کی لکھی ہوئی پانچ ہزار کتابیں جمع کر دی تھیں۔کتب خانے کے ساتھ کمرے بنوا دیے تھے، تاکہ ادباء وہاں آکر ٹھہریں اور کتابوں سے استفادہ کریں۔اس کتب خانے کا انچارج عبدالسلام البصری تھا، جو ابوعبیداللہ المرزبانی کا شاگرد تھا اور اَبوعلی الفارسی (۱۵۹) سے نیز اس نے پڑھا تھا (؟) ابوالعلاء جب بغداد گیا تو وہ اکثر اسی کتب خانہ قدیمہ ''دار سابور'' میں جایا کرتا تھا اور عبدالسلام البصری اس کا بڑا

دوست تھا۔

فرمایا کہ ''کتاب المحشی'' کا حال سنیے۔یہ کتاب خود عبدالسلام نے اپنے استاذ المرزبانی کے نسخے سے نقل کی تھی اور اس سے وزیر مؤید الدین ابن العلقمی نے ایک نسخہ نقل کروایا۔ یہ نسخہ میں نے قسطنطنیہ میں خود دیکھا ہے اور اس پر ابن العلقمی کی مہر ثبت ہے۔ اسی نسخہ سے الشنقیطی نے اپنا نسخہ نقل کیا، جس سے یہ کتاب چھاپ دی گئی ہے۔

فرمایا کہ اس وقت بغداد میں علم کی فروانی تھی۔ابوالعلاء کہتا ہے کہ: بغداد میں جتنی علم کی کثرت ہے، اتنی بصرہ میں کھجوروں کی بھی نہیں۔فرمایا کہ: چوتھی صدی کی آخر فقہاء شوافع کا زمانہ ہے اور پانچویں صدی میں جا کر اس ماحول سے بڑے بڑے فضلاء پیدا ہوئے۔اسی سلسلے کی برکت تھی کہ ابوالمعالی امام الحرمین الجوینی (۱۶۰) پیدا ہوئے اور پھر غزالی نکلے۔

فرمایا کہ ابوالطیب البصری فقہاء الشوافع کا استاذ کبیر تھا اور اکثر فقہاء ان کے شاگرد تھے۔فرمایا کہ یہ فقہاء آج کل کے معنی میں نہ تھے، وہ فقہاء بھی تھے اور ادباء بھی۔ یہی وجہ کہ ابو العلاء کی انہوں نے اتنی قدر کی۔

فرمایا کہ علم کا ذوق اس درجہ پر پہنچا کہ عوام بھی علمی تلمیحوں میں گفتگو کرتے اور جسر کا واقعہ سنایا، جس میں ایک نوجوان نے ''رحم اللہ علی ابن الجہم'' کہا، جس کے جواب میں نوجوان لڑکی نے ''رحم اللہ ابا العلاء المعری'' کہا۔

فرمایا کہ آج کل کوٹ پتلون کا چرچہ ہے اور جو بن سنور کر نکلتا ہے، اس کو بڑی عزت سے لوگ دیکھتے ہیں، حالانکہ وہ ''خر ابن خر'' ہے۔فرمایا کہ: آج کل لوگوں کی نظریں ڈاکٹر ضیاء الدین جیسے نچا چرہ (جمع خچر) کی طرف لگی ہوئی ہیں، جو پروپیگنڈے کر کر کے، لوگوں کو دھوکا دیتے ہیں کہ یہاں جامع مسجد زہرا بننے والی ہے، جو جامع ازھر کی مثال ہوگی (حالانکہ ازھر مذکر ہے اور اس سے زھراء مونث کہاں بڑھ سکتی ہے) مگر آج تک اس جامعہ زھراء کا نہ نام ہے نہ نشان۔

یکم مئی ۱۹۴۶ء

مغرب کے بعد جب استاذ صاحب لیٹے ہوئے تھے تو میں نیز جا کر بیٹھ گیا۔ علمی سلسلے کی باتوں کے دوران میں [فرمایا] کہ اب اس وقت ضرورت ہے کہ کتابوں کا پیچھا چھوڑ کر زندگی کے عام مشغلوں میں دلچسپی لوں، تاکہ صحت سالم رہے۔ فرمایا کہ: کتابوں کا کام بھی خوب کیا اور سب کچھ آنکھوں کے سامنے تھا اور ہے۔

فرمایا کہ مولوی بدرالدین اور مسٹر کرنیکو، ''المختار من شعر بشار'' (۱۶۱) کا مقابلہ کیا کرتے تھے۔ ایک بیت یاد آ گیا، جس کی معنی سمجھ میں نہ آئی۔ مسٹر کرنیکو نے ''تاج'' (۱۶۲) ''لسان'' (۱۶۳) وغیرہ دیکھ ماریں، لیکن بیت سمجھ میں نہ آیا۔ اتنے میں یہاں سے میں لائبریری میں داخل ہوا، تو مولوی بدرالدین صاحب نے بلالیا اور بیت سامنے رکھا۔ میں نے بیت دیکھتے ہی بتایا کہ یہ اس طرح ہے۔ تو مسٹر کرنیکو کہنے لگے کہ میں نے معاجم (۱۶۴) دیکھ لیے ہیں اور اس لفظ کی حقیقت سمجھ میں نہیں آئی، آپ کس بنا پر کہہ رہے ہیں کہ یہ لفظ یوں ہے، علاوہ اس کے یہ بیت نہایت مجہول ہے۔ اس پر میں نے مسٹر کرنیکو کو کہا کہ عبارت کے لحاظ سے میں جانتا ہوں اور مجھے یقین ہے کہ یہ لفظ اسی طرح ہونا چاہیے، بلکہ دوسرا ہو ہی نہیں سکتا۔ علاوہ اس کے یہ بیت جس کو آپ مجہول الذکر سمجھتے ہیں، وہ ایک قصیدہ کا بیت ہے، جو مجھے پورا یاد ہے۔ یہ کہہ کر میں نے پورا قصیدہ پڑھ دیا، تو مسٹر کرنیکو حیران ہو کر کہنے لگے کہ کیا آپ کو پورا عربی شعر حفظ ہے؟ میں نے کہا کہ یہ میں نہیں کہہ سکتا۔ لیکن کافی اشعار یاد ہیں۔ تو کہا کہ کتنے یاد ہوں گے؟ تو میں نے کہا کہ: علی الاقل ایک لاکھ بیت یا اس سے زیادہ یاد ہوں گے۔ تو کہنے لگے کہ آپ نے کتنا وقت یاد کرنے میں صرف کیا۔ اس پر میں نے کہا کہ مسٹر کرنیکو! میں نے کبھی اشعار یاد کرنے کی زحمت نہیں اٹھائی۔ بات یہ ہے کہ جب میں عربی کا طالب علم تھا، تو پڑھتے پڑھتے شعر یاد ہو جایا کرتے تھے۔ پھر مجھ سے مخاطب ہو کر کہا کہ بلوچ صاحب! میں نے ''متنبّی، حماسہ، معلقات اور چند اراجیز شاید عمداً یاد کیے ہوں۔ باقی اشعار خواہ مخواہ ذہن میں آ گئے ہیں۔ فرمایا کہ یاد کرنے کے معنی یہ کہ ان اشعار کا گاہے گاہے ذوق سے پڑھ لیا کرتا تھا وبس۔

۳ مئی ۱۹۴۶ء

آصف جاہ فیضی سیکریٹری اسلامک ریسرچ ایسوسی ایشن کی طرف سے ''لسٹ ممبران'' پہنچی جس میں ''Ondinay Fellows'' میں استاذ کا نام اول مطبوعہ تھا۔ استاذ صاحب نے کہا کہ ان بے چاروں کو میں نے جواب تک نہیں دیا، اور انہوں نے جواب کی امید پر نام چھاپ دیا ہے، بہرحال ضروری ہے کہ ان کو شکریہ کا خط لکھ دیا جائے۔ میں نے انگریزی میں شکریہ کا خط لکھا اور استاذ صاحب نے اپنی مصنفات کی فہرست لکھی اور خط روانہ کیا گیا۔

۱۵ مئی ۱۹۴۶ء

بعد طعام مغرب جب استاذ صاحب ٹہل رہے تھے تو اس وقت اس کے ساتھ رفاقت کی۔ مجد الدین فیروز آبادی (۱۶۵) کی کتاب ''تحفۃ الأبیہ لمن نسب إلی غیر ابیہ'' کا ذکر آیا، فرمایا کہ کتابوں میں سے ایک کتاب ہے، باقی اس کی معلومات کچھ نہیں۔ فرمایا کہ اس سلسلہ میں حلوانی کی کتاب ''من نسب إلی أمہ'' جو صاحب ''خزانہ'' کو ملی تھی، نہایت ہی بے نظیر تھی۔ ''من نسب الی أمہ'' ابن حبیب (۱۶۶) کی غنیمت ہے اور اس پر میں نے کام کیا ہے۔ فرمایا کہ ابن حبیب کی والدہ کا نام حبیب بتایا جاتا ہے۔ لہٰذا بعض لوگ حبیب کو غیر منصرف پڑھتے ہیں اور حبیب کو مونث سمجھتے ہیں اور بعض اس کو منصرف پڑھتے ہیں۔

محمد محمود الشنقیطی کا ذکر آیا۔ میں نے کہا کہ امرؤ القیس کا دیوان بروایت کوفیین جو شنقیطی نے نقل کیا ہے، کافی صاف ہے اور اس پر جابجا تصحیحات کی ہیں، تو فرمایا کہ اصل نسخہ اس سے بھی صاف ہے اور شنقیطی کی یہ خامی ہے کہ اصلی نسخے، جن سے انہوں نے یہ کتابیں نقل کی ہیں اور جو قسطنطنیہ کے کتب خانوں میں موجود ہیں، ان کا ذکر نہیں کرتا۔ اور مصر والوں نے ان کی نقل شدہ کتابیں شنقیطی کے کتب خانے کے نام سے چھاپ دیں، جو بری بددیانتی ہے۔ ان کتابوں کے اصل نسخے قسطنطنیہ کے کتب خانوں میں موجود ہیں، جن سب کا میں نے سراغ لگایا اور اپنی آنکھوں سے جا کر دیکھے۔ افسوس ہے مطبوعہ کتابوں میں ان اصلی نسخوں کا ذکر نہیں آتا، جو سلاطین ترکیہ کے ساتھ بڑی بے انصافی ہے۔ فرمایا کہ ترکوں کو بھی اس بات کا علم ہو گیا ہے اور اس

وجہ سے مصریوں سے بگڑے ہوئے ہیں کہ یہ لوگ یہاں سے کتابیں نقل کروا کر چھاپتے ہیں اور ان کتب خانوں کا ذکر نہیں کرتے۔

فرمایا کہ شنقیطی ایک لائق آدمی تھا۔ متعدد کتابیں نقل کیں اور علم کی خدمت کی۔ اس میں نقص یہ ہے کہ دھاندلی باز ہے۔ ایک بات جو اس کے دماغ میں آجاتی ہے وہ اس پر اڑ جاتا ہے۔ چنانچہ دیوان امرؤالقیس کے استنساخ میں اس نے عمر کو منصرف پڑھا ہے اور جابجا اوپر سے صحیح صحیح لکھ رکھا ہے [میں نے خود دیکھا اور استاذ صاحب نے نیز پوچھا] حالانکہ عمر باتفاق علماء غیر منصرف ہے۔ فرمایا کہ ایسی دھاندلی بازیوں سے اس نے کہیں کہیں اپنے علم کو مکدر کر دیا ہے۔

فرمایا کہ مخصص لابن سیدہ البطلیوسی (۱۶۷) پر شنقیطی نے حواشی لکھے ہیں، میں نے ان کو غور سے پڑھا اور کہیں کہیں ان کی دھاندلی بازیاں دیکھ کر خیال آیا کہ انہوں نے جو لکھا، اس کا مناقضہ کر دوں۔ فرمایا کہ دھاندلی باز آدمی ہمیشہ گرفت میں آجاتا ہے۔ فرمایا کہ ان حواشی میں سے اگر ان کی دھاندلی بازیوں کو نکال دیا جائے، تو باقی معلومات کی قدر کرنی پڑے گی اور وہ شنقیطی کے علم وفضل کا پتا دیتی ہیں۔ فرمایا کہ دھاندلی بازی میں شنقیطی اور سورتی ابوعبداللہ کی ایک ہی حالت تھی۔ فرق یہ تھا کہ شنقیطی کا علم زیادہ مفید و وسیع تر تھا۔

فرمایا کہ قسطنطنیہ کے کتب خانوں میں بے نظیر قلمی کتابیں محفوظ ہیں اور یہ سب سلاطین ترکیہ کے وزراء کی عنایت ہے۔ فرمایا کہ یورپ والے خود مانتے ہیں کہ کتابیں اگر ہیں تو قسطنطنیہ میں۔ یورپ میں بھی ان لوگوں نے جمع کر رکھی ہیں مگر اتنی نایاب نہیں۔ فرمایا کہ ان کتب خانوں پر نظر وہی شخص ڈال سکتا ہے جس کا علم وسیع ہو، کتابوں کے نام اور اہمیت اس کے سینے میں محفوظ ہوں۔ باقی یورپ والے کم علم دکا ترہ تو ایک ہی کتب خانے میں الجھ کر رہ جاتے ہیں۔ فرمایا: بلوچ صاحب! مجھے ایک لاکھ کے قریب کتابوں کے نام یاد تھے، جو اگلے پچھلے زمانے میں لکھی گئی ہیں اور ایک لاکھ سے زیادہ اشعار حفظ تھے، لیکن ان نامناسب حالات [مراد گھر کے نامناسب حالات اور علی گڑھ یونیورسٹی کے نامناسب حالات] نے کھیل بگاڑ کر رکھا۔

فرمایا کہ قسطنطنیہ میں چند روز قیام کے زمانے میں، میں نے ان جملہ نوادرات کا پتا

لگالیا، جوان کتب خانوں کی زیب وزینت بنے ہوئے ہیں اور جن میں سے اکثر کا یورپ والوں خواہ دیگر دیکھنے والوں کو علم تک نہیں، وہ فہرست میرے پاس موجود ہے (بندے نے نیز دیکھی تھی جب استاذ صاحب یاقوت کی کتاب ''معجم الادباء'' پر حواشی لکھ رہے تھے، اگر فرصت ملی تو لے کر نقل کرلوں گا)

فرمایا کہ غریب الحدیث کی اکثر کتابیں قسطنطنیہ میں محفوظ ہیں۔ فرمایا کہ ابوسعید السیر افی، امام الصاغانی اللاھوری وغیرہ کے ہاتھ کی لکھی ہوئی کتابیں موجود ہیں۔

پھر فرمایا کہ ہندوستان میں نیز بعض نوادارات موجود ہیں۔ آغا محمد علی پروفیسر جامعہ عثمانیہ کے پاس:

۱۔ شرح کتاب سیبویہ لابی سعید السیر افی (۱۶۸)، خود ابوسعید کے ہاتھ کی لکھی ہوئی موجود تھی، جوانہوں نے مجھے دکھائی اور میں عش عش کرنے لگا۔

۲۔ اسی طرح دیوان صائب خود صائب، کے ہاتھ کا لکھا ہوا (۱۶۹) ان کے ہاں موجود ہے۔

۳۔ اور شاید قاموس کا مصنف (۱۷۰) کے ہاتھ کا لکھ ہوا نسخہ ان کے ہاں موجود ہے۔

۲۰ مئی ۱۹۴۶ء

أنشدنا الأستاذ لبعض شعراء عصر مامون العباسی ۔(استاذ نے عصر مامون کے ایک شاعر کے یہ اشعار پڑھے)

دعی بالکتابه یدعیها
کدعوی آل حرب فی زیاد
فدع عنک الکتابة لست منها
ولو سودت وجهک بالمداد

۲۱ مئی ۱۹۴۶ء

استاد نے دوران گفتگو یہ اشعار پڑھے

الجود و الغول و العنقاء ثالثه أسماء أشياء لم توجد ولم تكن

الحماسی

وبالدير أشجانی و كم من شج له

دوين المصلی بـالبقيع شجـون

قال التبريزی و دوين تصغير دون ای دون المصلی بقليل

(من شـعـر خـلف بـن خـليـفة الاقطع، شرح الحماسة للتبريزی جلد : ۲ص: ۱۸۲)

۱۱ جون ۱۹۵۶ء

استاد نے یہ شعر پڑھا اور اپنے ہاتھ سے لکھا

أَفَدْتُ بِهِجْـرَانِ الْمَطَاعِـمِ صحـةً

فَمَا بِیَ مِنْ دَاءٍ يُّخَافُ وَلَا جِبَنْ (۱۷۱)

(المعری بخط المیمنی ۱۱/۶/۵۶ـ)

قبلہ استاذ صاحب کراچی سے آج حیدرآباد تشریف لائے۔کل ایم اے عربی کا۔ وائے وا۔لیں گے۔ بندے کے ہاں مقیم ہیں۔آج ۴ سے ۶ بجے شام دوران گفتگو میں فرمایا کہ زندگی میں اگر کام کرنا ہوتو ان باتوں کا خیال رکھیں۔

عورت کے پیچھے نہ پڑ جائیں۔کھانے کے پیچھے نہ پڑ جائیں۔غم آتے رہتے ہیں،لیکن غم غلط کرنے کے راستے نکالیں اور دنیا بھر کا غم نہ پالیں۔کھانے کے سلسلے میں اوپر والا شعر (افدت الخ) پڑھا اور لکھا۔

۱۹۶۷ء

استاذ صاحب سندھ یونیورسٹی میں تشریف لائے۔تاریخ پر گفتگو ہوئی۔فرمایا کہ عضد

الدولہ نے تاریخ ہند لکھوائی تھی، جس کا حوالہ ''کتاب الہند'' میں موجود ہے۔ اب اس کا پتا چل گیا ہے، لیکن جب تک نسخہ دیکھا نہ جائے، اس کے متعلق کچھ نہیں کہا جا سکتا۔

فرمایا کہ مدینہ منورہ میں تاریخ گجرات مصنف (؟) کے ہاتھ کا لکھا ہوا نسخہ موجود ہے۔

فرمایا: امالی ابن درید ص: ۸۲ میں ابوعطاء کے اشعار موجود ہیں۔

[أنشد الأصمعی (۱۷۲) لأبی عطاء السندی (۱۷۳)]

فـمـا سألتک إلا قـلـت تخدعنی

ولا استعنتک إلا قـــلـت مشغول

أجل شغـلـت ولو أعطيت من سعة

حتی يـواری لحی رأسک الحول

(نسخہ خطیہ)

۷۔ اگست ۱۹۶۸ء

(الف) فرمایا کہ میرے اور امام الشوکانی کے درمیان صرف دو واسطے ہیں۔ ۱۳۲۶ھ میں، میں نے شیخ حسین ابن محسن (۱۷۴) سے روایت احادیث کا اجازہ حاصل کیا۔ انہوں نے امام الشوکانی کے لڑکے اور محمد بن ناصر الحازمی سے پڑھا تھا جو دونوں امام الشوکانی کے شاگرد تھے۔ میری ولادت ۱۳۰۲ھ کی ہے اور نواب صدیق حسن خاں ۱۳۰۷ میں فوت ہوئے۔ اور ہم دونوں کے استاذ ایک ہی ہیں یعنی شیخ حسین بن محسن۔ (راجع ابجد العلوم (۱۷۵))

(ب) فرمایا کہ ''کتاب الدلائل'' (۱۷۶) قاسم ابن ثابت السرقسطی (۱۷۷) کی غریب الحدیث میں ایک معرکۃ الآرا کتاب ہے۔ اس کی دو جلدیں ''کتب خانہ دائریہ'' دمشق میں موجود تھیں۔ جلد اول تو غائب ہوگئی، باقی ایک جلد باقی ہے، جو قرطبہ کی لکھی ہوئی ہے۔ قرطبہ کا خاتمہ ۶۳۰ھ کے قریب ہوا۔ یہ کتاب اس سے کچھ پہلے کی لکھی ہوئی ہے۔ میں نے مرحوم عز الدین التنوخی کو کہا کہ اس کو چھاپ دیجیے۔ انہوں نے اس کے شایع کرنے کا اعلان بھی کیا، لیکن حال ہی میں فوت ہوگئے۔ یہ کتاب قاسم نے لکھنا شروع کی، وہ رخصت ہوئے تو ان کے والد

ثابت نے مکمل کی۔ ابو عبیدہ اور ابن قتیبہ سے جو غریب الاحادیث رہ گئی ہیں۔ ان کا تکملہ اس کتاب میں ہے۔

۱۸ اگست ۱۹۶۸ء

مراکش کے سفیر محمد السعد انی فی باکستان نے ''سمط الآلی'' پڑھی تھی۔ چنانچہ پاکستان آئے تو اشتیاق سے استاذ صاحب سے ملے۔ استاذ سے حدیث کی روایت کا اجازہ طلب کیا۔ استاذ صاحب نے اجازہ دیا۔ (استاذ نے اجازہ حاصل کیا، جیسا کہ اوپر الف میں موجود ہے)

۳۰ مارچ ۱۹۷۰ء

آج استاذ صاحب یہاں حیدرآباد میں میرے سندھ یونیورسٹی آفس میں تشریف لائے۔ کافی دیر تک ان کے علمی ارشادات سے بندہ مستفید ہوا۔ فرمایا کہ تصوف میں حضرت علی رضی اللہ عنہ کے شاگرد حسن البصری کا رسالہ پہلی تصنیف ہے اور میرے ہاں جو قلمی نسخہ ہے وہ نوادرات میں سے ہے، حالانکہ قریبی زمانے میں لکھا گیا۔

بیت کے معانی پوچھے تو فرمایا کہ شعر کے معنی ہیں: قصیدہ، یا دیوان۔ بیت، شعر کا ٹکڑا ہے۔ بیت الشعرا'' کہا جاتا ہے۔ بیت یعنی دو مصراعوں کا مجموعہ، یہ قصیدہ کا ایک بیت ہے یا گھر ہوا ۔ گویا قصیدہ ایک بڑی حویلی ہے۔

إن أحسن بيت أنت قائله

بيت يقال إذ أنشدته صدقا

فرمایا: یہ حسان کی طرف منسوب ہے۔ فلیتأمل

فرمایا بیت، وتد، طنب (ج اطناب) عربوں کے گھر کے مصطلحات ہیں۔ علم عروض کے مصطلحات عربوں کے گھر سے لیے گئے ہیں۔ ابو العلاء المعری نے سقط الزند کے پہلے قصیدہ میں کہا ہے۔

فالحسن يظهر في شيئين رونقه

بيت من الشِعر او بيت من الشَعر

کلمہ اور قافیہ: فرمایا شعر یا قصیدہ کے معانی میں ہیں۔ حدیث میں ہے کہ

☆ أصدق كلمة قالها شاعر كلمة لبيد :

ألا كل شئ ماخلا الله باطل

وكل نعيم لا محالة زائل

☆ قال نابغۃ: ''أذود القوافی عنی ذیادا'' (میں اشعار کو اپنے آپ سے ہٹاتا ہوں، جب کہ وہ آتے ہیں)

گفتگو کے دوران نعمت خاں عالی کا یہ شعر پڑھا اور میری استدعا پر اپنے قلم سے لکھا:

برخر نمی توان زخریت عتاب کرد

تعلیقات وحواشی

(۱) دمامینی کا تذکرہ آگے آرہا ہے۔

(۲) (ترجمہ): اے علماء ہند! آپ کی عمر دراز ہو، اور اللہ تعالیٰ کے فضل وعنایت سے تکالیف آپ سے ہٹ جائیں۔ تم نے عقلی علوم (منطق وفلسفہ) میں سعادت مندی کی آس لگائے بیٹھے ہو، مجھے تو خطرہ ہے کہ آپ کی یہ امید ناکام ہوگی۔ نہ اثیر الدین ابہری کی تصانیف میں ہدایت ہے، نہ ابن سینا کی ''اشارات'' میں آپ کی شفاء ہے۔ نہ مطالع (سراج الدین ارموی ت:۶۸۲ھ کی منطق میں تالیف) سے ہدایت کا سورج طلوع ہوسکتا ہے۔ ان (فلسفی ومنطقی علوم) کے اوراق میں تاریکی ہی مل سکتی ہے، نہ کہ روشنی۔ تم نے کفریہ علوم کو شریعت کا درجہ دے رکھا ہے، گویا کہ یونانی فلسفی آپ کے انبیاء ہیں۔

(۳) جلال الدین عبدالرحمٰن بن ابی بکر سیوطی (ت:۹۱۱ھ)

(۴) سیوطی کی تصانیف کی تعداد تقریباً ایک ہزار ہے۔ احمد خازندار نے ''دلیل المخطوطات السیوطی'' کے نام سے اس کی فہرست مرتب کی ہے۔ جو ۱۹۸۳ء میں کویت سے شایع ہوئی اس میں سیوطی کی ۹۸۱

کتب ورسائل کا تذکرہ کیا ہے۔

(۵) علامہ سیوطی کا یہ کتاب دو جلدوں میں شیخ محمد محمود شنقیطی کی تصحیحات وتعلیقات کے ساتھ، ۱۹۶۶ء میں لجنۃ التراث العربی سے شایع ہوئی۔

(۶) عبدالقادر البغدادی (ت: ۱۰۹۳ھ) عربی ادیب اور تاریخ کے ماہر تھے۔ ترکی وفارسی زبان بھی جانتے تھے۔

(۷) سبط ابن الجوزی: ابوالمظفر یوسف (ت: ۶۵۴ھ) کشف الظنون میں لکھا ہے کہ یہ کتاب چالیس مجلدات میں ہے۔

(۸) لیکن علامہ ذہبی ان کو اس تاریخ میں ثقہ نہیں مانتے۔

(۹) عزالدین علی بن الجزری (ت: ۶۳۰ھ)

(۱۰) یاقوت حموی (یاقوت بن عبداللہ حموی رومی) ت: ۶۲۶ھ ۔کی تصالیف ہے، حموی کا دوسرا کارنامہ ''معجم البلدان'' ہے۔

(۱۱) اس سے پہلے یہی کتاب ''معجم الأدباء'' مشہور مستشرق ڈیوڈ سیموئل کی تحقیق کے ساتھ ۱۹۰۷ء میں پھر ۱۹۲۲ء میں بیس جلدوں میں شائع ہوئی۔ اوراب پھر لبنان سے اس کا عکس شائع ہوا ہے۔

(۱۲) ابن خلکان، ابو العباس احمد بن محمد ت: ۶۸۱ھ یہاں مراد اس کی کتاب ''وفیات الأعیان'' ہے۔

(۱۳) ابو سعد عبدالکریم بن محمد مروزی سمعانی ت: ۵۶۲ھ، انہوں نے اپنی ''کتاب الأنساب'' کی وجہ سے شہرت پائی۔

(۱۴) ابن نجار، حافظ محب الدین محمد بن محمود (ت: ۶۴۳ھ)

(۱۵) ابوالحجاج یوسف بن سلیمان بن عیسیٰ (ت: ۴۷۶ھ)

(۱۶) ''ستہ'' یعنی: چھ۔اس سے مراد چھ شعراء مراد ہیں۔امرؤالقیس، نابغہ، ذبیانی، علقمہ بن عبدۃ، زہیر بن أبی سلمی، طرفۃ بن العبد اور عنترہ بن شداد، جن کے اشعار کو جمع کر کے، شنتمری نے ان کی شرح لکھا۔

(۱۷) محمد بن یوسف الأندلسی (ت: ۷۴۵ھ) صاحب تفسیر بحر محیط۔

(۱۸) ابوعبیدۃ معمر بن المثنیٰ (ت: ۲۱۰ھ)

(۱۹) الأغانی، ابوالفرج علی بن حسین اصفہانی (ت: ۳۵۶) کی مشہور تالیف۔

(۲۰) الأمالی، تالیف: ابوعلی القالی اسماعیل بن قاسم (ت: ۳۵۶ھ)

(۲۱) زہیر بن ابی سلمی (وفات ۱۳ قبل الہجرۃ) اصحاب معلقات سبعہ میں سے ایک مشہور شاعر، حجاج بن کعب بن زہیر کے والد صاحب۔

(۲۲) کعب بن زہیر (وفات: ۲۶ھ، مشہور صحابی، قصیدۂ بانت سعاد کی وجہ سے شہرت پائی، جوانہوں نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں پیش کیا۔

(۲۳) عنترۃ بن شداد (ت: ۲۲ قبل از ہجرت) عرب کے مشہور شہسوار اور شاعر۔

(۲۴) عروۃ بن حزام (ت: ۳۰ھ) مشہور شاعر۔

(۲۵) علقمۃ الفحل بن عبدۃ (ت: ۲۰ قبل از ہجرت) امری القیس کا ہمعصر۔

(۲۶) نابغۃ الذبیانی زیاد بن معاویۃ (ت: ۱۸ قبل از ہجرت)

(۲۷) طرفۃ بن العبد (ت: ۶۰ قبل از ہجرت)۔

(۲۸) ابن سکیت یعقوب بن اسحاق (ت: ۲۴۴ھ)۔

(۲۹) ابوالعباس احمد بن یحیٰ الکوفی، امام الکوفیین فی النحو واللغۃ (ت: ۲۹۱ھ)۔

(۳۰) لبید بن ربیعۃ العامری (ت: ۴۱ھ)۔

(۳۱) پورچوگال کے جنوبی علاقہ میں واقع اس شہر کا آج کل نام فارو (Faro) ہے۔

(۳۲) خزانۃ الادب کافی پہلے ۴ جلدوں میں شائع ہوئی تھی۔ جو شرح الکافیہ للرضی کے شواہد کی شرح پر مشتمل ہے۔

(۳۳) یوسف بن الحسن بن عبداللہ بن المرزبان السیرافی (ت: ۳۸۵ھ) جو مشہور نحوی حسن بن عبداللہ سیرافی (ت: ۳۶۸ھ) کے بیٹے ہیں۔ حسن بن عبداللہ سیرافی نے ''کتاب سیبویہ'' کی شرح لکھی تھی، جب کہ اسی کے بیٹے یوسف نے کتاب سیبویہ کے شواہد پر کام کیا۔ اس کا مطبوعہ نسخہ راقم کے پاس موجود ہے۔

(۳۴) سیرانی کی ''شرح شواہد سیبویہ'' کا مطبوعہ نسخہ راقم کے پاس دو جلدوں میں موجود ہے۔

(۳۵) حسن بن صافی بن عبداللہ، لقب: ملک النحاۃ (نحویوں کا بادشاہ) ت:۵۶۸ھ، اس نے حریری کے طرز پر ''مقامات'' بھی ترتیب دیا تھا۔

(۳۶) محمد بن ابی بکر الدمامینی بدرالدین (ت:۸۲۷ھ)

(۳۷) حسن بن محمد الحنفی، رضی الدین۔ لغت عربیہ کے امام تھے، اس میں ان کی کافی کتب ہیں، ''العباب'' نامی لغت کی کتاب، انہوں نے ابن العلقمی وزیر مستعصم باللہ کے لئے تصنیف فرمائی، یہ سندھ میں بھی تشریف فرما ہوئے۔

(۳۸) جمال الدین ابو محمد عبداللہ بن یوسف المعروف ابن ہشام الأنصاری (ت:۷۶۲ھ)

(۳۹) اس رد کا نام ''تحفۃ الغریب'' ہے، راقم کے پاس موجود ہے۔

(۴۰) یہ ''منہل صافی''، حس ''وافی'' کی شرح ہے، اس کا تعلق نحو سے ہے، جو کہ محمد بن عثمان بن عمر بن البلخی کی تالیف ہے، چونکہ گجرات میں یہ کتاب داخل درس تھی اس لئے اس کی شرح لکھی۔

(۴۱) شاید اس سے مراد عروض میں لکھی گئی اس کی کتاب ''جواہر البحور'' ہے، انہوں نے ''خزرجیہ'' فی العروض کی شرح بھی لکھی تھی۔ دمامینی نے صحیح بخاری کی شرح بھی لکھی تھی۔ جو تازہ شائع ہوئی ہے۔

(۴۲) لسان العرب، عربی لغت کی مشہور کتاب: اس کا مؤلف ابن مضور محمد بن مکرم الانصاری ہے جو ۶۳۰ھ میں پیدا ہوئے، ۷۱۱ھ میں وفات پائی، جب صغانی ۶۵۰ میں فوت ہوئے، تو اس وقت ابن منظور ۲۰ سال کے تھے۔

(۴۳) یعنی ابن منظور نے ''لسان العرب'' چار کتابوں کو سامنے رکھ کر ترتیب دی ہے: صحاح جوہری، تہذیب ازہری، محکم ابن سیدۃ اور نہایۃ ابن الاثیر۔

(۴۴) کیونکہ یہ کتاب ۲۰ جلدوں میں شائع ہوئی ہے۔

(۴۵) ''بکم'' کے لفظی معنی ہیں: گونگا ہونا، خاموش رہنا، یعنی عجیب اتفاق ہے کہ صغانی جب ''بکم'' کے لفظ تک پہنچے (عباب کی تالیف میں) تو فوت ہوئے۔ یعنی خاموش ہوگئے، اور بکم کے معنی بھی یہی ہیں۔

(۴۶) وہ شعر یوں ہے:

إن الصغانی الذی حاز العلوم والحکم

کان قصاری أمـــره أن انتهی إلی بکم

(۴۷) محمد بن یعقوب فیروزآبادی شیرازی (ت: ۸۱۷ھ)

(۴۸) اس کا پورا نام یوں ہے: القاموس المحیط والقابوس البسیط الجامع لما ذہب من کلام العرب شماطیط۔ بعد میں اس قاموس نے بڑی شہرت پائی، بعض نے اس کی شروح لکھیں، بعض نے اختصار کیا۔ بعض نے ردّ لکھے، بعض نے ذیل لکھے، ہندوستانی عالم شیخ مرتضٰی زبیدی نے جہاں اس کی شرح ''تاج العروس'' کے نام سے لکھی، وہاں اس قاموس میں رہ جانے والے الفاظ کی لغوی معانی پر مشتمل ایک ذیل لکھا، جو ''الذیل والتکملۃ والصلۃ'' کے نام سے آٹھ جلدوں میں شایع ہوا ہے اور تاج العروس، کویت کی وزارۃ الاعلام کی طرف سے ۴۰ جلدوں میں شائع ہوئی ہے، دونوں راقم کے پاس موجود ہیں۔

(۴۹) ابن القطاع علی بن جعفر السعدی (ت: ۵۱۵ھ)

(۵۰) السرقسطی: اُبوطاہر محمد بن یوسف (ت: ۵۳۸ھ) جس نے مقامات حریری کے مقابلہ میں ''مقامات لزومیہ'' لکھی تھی۔ جو راقم کے ہاں موجود ہے۔

(۵۱) ابن القوطیہ محمد بن عمر (ت: ۳۶۷ھ) ان کے اس کتاب کا نام ''الافعال الثلاثیۃ والرباعیۃ'' ہے۔

(۵۲) قاضی ابوعبداللہ حسن بن احمد زوزنی (ت: ۴۸۶ھ) تقی بینش کی تحقیق کے ساتھ تہران میں شایع شدہ ۱۳۷۴ھ ش، راقم کے پاس محفوظ ہے۔

(۵۳) بیہقی، ابوجعفر بن علی بن محمد (ت: ۵۴۴ھ) ان کی اس کتاب کا نام ''تاج المصادر'' ہے، جو دو جلدوں میں، دکتر ہادیٔ عالم کی تحقیق کے ساتھ، تہران سے ۱۳۶۶ھ ش میں شایع ہوئی، میرے مطالعہ میں رہی ہے۔

(۵۴) شیخ محمد عابد السندی، صاحب حصر الشارد، (ت: ۱۲۵۷ھ)

(۵۵) صالح بن محمد الفلانی (ت: ۱۲۱۸) صاحب ''قطف الثمر''۔

(۵۶) ابو ہلال حسن بن عبداللہ بن سہل عسکری (ت:۳۹۵ھ)، عربی کہاوتوں میں لکھی گئی اپنی کتاب ''جمہرۃ الامثال'' کی وجہ سے شہرت پائی، اوائل پر سب سے پہلے انہوں نے ہی قلم اٹھایا۔ البتہ یہ بات ذہن میں رکھنی چاہئے کہ ''تصحیحات المحدثین'' نامی کتاب بھی ایک عسکری کی تالیف ہے، لیکن وہ حسن بن عبداللہ بن سعید (ت:۳۸۲ھ) ہے، جو اس ابو ہلال عسکری کا ماموں ہے۔

(۵۷) احمد بن فارس بن زکریا قزوینی رازی (ت:۳۹۵ھ) صاحب ''مقاییس اللغۃ'' و ''مجمل اللغۃ''۔ اس کے اس حماسہ کا نام ''الحماسۃ المحدثۃ'' ہے۔

(۵۸) حماسہ بصریہ: ابوالحسن علی بن ابی الفرج البصری (ت:۶۵۶ھ) کی تالیف ہے۔

(۵۹) ابوتمام حبیب بن اوس طائی (ت:۲۳۱ھ) جس نے عرب کے مشہور شعراء کے کلام کا مجموعہ دس ابواب پر مرتب کر کے ''دیوان الحماسۃ'' نام دیا، درحقیقت ''الحماسۃ'' اس کا پہلا باب ہے۔ اب ساری کتاب کا نام ''حماسہ'' ہوگیا، اس کے بعد اور لوگوں نے بھی اسی طرز پر حماسہ جات ترتیب دیے، مثلاً: حماسہ بحتری (ت:۲۸۴ھ)، حماسہ شمیم حلی (ت:۶۰۱ھ) حماسہ ابن الشجری (ت:۵۴۲ھ) وغیرہ۔ بعض حماسہ جات کا ذکر میمنی صاحب نے بھی کیا ہے۔

(۶۰) یہاں ڈاکٹر صاحب نے حماسہ صغری کی شہرت (مشہور نام) نہیں لکھا، جگہ خالی چھوڑ دی ہے، اس سے مراد ''الوحشیات'' ہے، جو میمنی صاحب کی تعلیقات وحواشی کے ساتھ مصر سے شائع ہو چکی ہے۔

(۶۱) ابن القطاع الصقلی، ابوالقاسم علی بن جعفر (ت:۵۱۵ھ)

(۶۲) اس کا مکمل نام: العروض البارع بالاختصار والجامع'' ہے۔

(۶۳) عثمان بن جنی الموصلی (ت:۳۹۲ھ) صاحب ''الخصائص'' و ''تصریف ملوکی'' و ''منصف'' وغیرہ۔ ابن جنی کی ''مختصر القوافی'' طبع شدہ راقم کے پاس موجود ہے، جو میں نے علامہ قاسمی صاحب کے پاس درساً پڑھی تھی۔

(۶۴) ابن حاجب، عثمان بن عمر (ت:۶۴۶ھ) کے اس قصیدۂ لامیۃ کا مکمل نام ''المقصد الجلیل فی علم الخلیل'' ہے۔

(۶۵) جمال الدین عبدالرحیم بن حسن السنوی (ت:۷۷۲ھ)

(٦٦) قصیدہ خزرجیہ، جو امام ضیاء الدین عبداللہ بن محمد خزرجی کی تالیف ہے۔

(٦٧) ۱۳۳۸ھ میں مطبع مجیدی کانپور سے شائع شدہ منتخب النفاس کا نسخہ راقم کے پاس موجود ہے۔اور نفائس اللغات بھی میں نے دیکھی ہے۔

(٦٨) مفتی عنایت احمد کی ''علم الصیغہ'' فارسی، آجکل داخل نصاب دینی مدارس ہے۔

(٦٩) کہتے ہیں کہ: اردو میں سیرت نبوی پر پہلی کتاب ''تواریخ حبیب الہ'' ہے۔

(٧٠) سندھ کے علماء میں یہ کمال مخدوم محمد ابراہیم بن عبداللطیف بن محمد ہاشم ٹھٹوی (ت:۱۲۲۵ھ) کو حاصل ہے کہ ان کی سب تالیفات کے ناموں سے ان کی تاریخ تالیف ابجد کے حساب سے معلوم ہو جاتی ہے۔

(٧١) خزانۃ الأدب، تألیف: عبدالقادر بغدادی (ت:۱۰۹۳ھ)

(٧٢) بدیع الزمان احمد بن حسین ہمذانی (ت:۳۹۸ھ) قوت حافظہ میں ضرب المثل تھے، اپنی مقامات میں سے اکثر مقامہ انہوں نے ارتجالا (فی البدیہہ) لکھے، ان کے بارے میں یہ بھی مشہور ہے کہ کبھی کبھی وہ خط آخری سطر سے شروع کر کے اول سطر تک لاتے، اور پھر بھی کوئی فرق نہ پڑتا۔

(٧٣) مقامات کا موجد بدیع الزمان کو مانا جاتا ہے اس کے بعد جو مقامات لکھے گئے ہیں، ان میں سے، مقامات حریری، مقامات زمخشری، مقامات سیوطی، مقامات، حمیدی، مقامات لزومیہ، مقامات نظریہ، راقم کے پاس موجود ہیں، مقامات نظریہ کا مؤلف ابوبکر بن محسن باعبود حضرمی ہے، جس کا تعلق بارھویں صدی ہجری سے ہے، انہوں نے اپنی مقامات کے نام ہندوستانی شہروں پر رکھے ہیں (کیونکہ وہ ہندوستان میں رہ چکے تھے) مثلاً: المقامۃ السورتیۃ، احمدنگریہ، بیجاپوریہ، حیدرآبادیہ، اورنگ آبادیہ وغیرہ) کاش کہ علماء سندھ میں سے بھی کوئی عربی ادب کا ماہر اسی طرز پر مقامات لکھے جن کے نام اس طرح ہوں: شکارپوریہ، سکریہ وغیرہ۔

(٧٤) ابن درید، ابوبکر محمد بن الحسن ازدی، صاحب ''مقصورۃ'' و''الاشتقاق''

(٧٥) ''دمیۃ القصر'' عربی شعراء کے تذکرہ جات کی ایک کڑی ہے، اس سلسلہ میں بنیادی تذکرہ ''البارع فی اخبار الشعراء المولدین'' ہے، جو ہارون بن علی ابن النجم (ت:۲۸۸ھ)) نے ترتیب دی، جس پر ابو منصور عبدالملک بن اسماعیل ثعالبی (ت:۴۳۰ھ) نے ''یتیمۃ الدھر'' کے نام سے ذیل لکھا، اس پر

ابوالحسن علی بن الحسن باخرزی نے ''دمیۃ القصر'' کے نام سے ذیل لکھا، اس پر سعد بن علی الوراق الحظیری (ت: ۵۶۸ھ) نے ''زینۃ الدھر'' کے نام سے ذیل لکھا، اس پر محمد بن الکاتب اصفہانی (ت: ۵۹۷ھ) نے ''خریدۃ القصر'' کے نام سے ذیل لکھا۔ ''دمیۃ القصر'' پر ایک دوسرا ذیل ''وشاح الدمیۃ'' کے نام سے، ابوالحسن علی بن زید بیہقی نے لکھا۔ اسی طرح ''یتیمۃ الدھر'' پر حسن مظفر نیساپوری (ت: ۴۴۳ھ) نے بھی ایک ذیل لکھا تھا۔

(۷۶) معجم ''مقاییس اللغۃ'' چھ جلدوں میں راقم الحروف کے پاس موجود ہے۔

(۷۷) شاید اس ابن القطان سے مراد ابوالحسن علی بن ابراہیم (ت: ۳۴۵ھ) ہے

(۷۸) ثعلب لقب ہے، اصل نام: ابوالعباس احمد بن یحییٰ (ت:۲۹۱ھ)

(۷۹) ابوعمر زاہد المطرز سے مراد: محمد بن عبدالواحد الباوردی (ت: ۳۴۵ھ) ہے جو ثعلب کے غلام تھے۔

(۸۰) ''تمام الفصیح'' درحقیقت ''فصیح اللغۃ'' ثعلب کا تکملہ ہے، جس کو سب سے پہلے انگریز مستشرق آربری نے ۱۹۵۱ء میں شایع کیا، اس کے بعد ڈاکٹر ابراہیم سامرائی کی تحقیق کے ساتھ ۱۹۷۱ء میں شایع ہوا۔

(۸۱) ''مجمل اللغۃ'' ابن فارس۔ مکمل طور پر پہلی مرتبہ ۱۹۸۵ء میں معہد المخطوطات العربیہ کویت نے، شیخ ہادی حسن کی تحقیق کے ساتھ شایع کی، ۵ جلدوں پر مشتمل یہ کتاب راقم کے پاس موجود ہے۔

(۸۲) یہ حصہ ابتدائی سات حروف پر مشتمل تھا، جو شیخ شنقیطی نے ۱۹۱۱ء میں شایع کیا۔

(۸۳) ''کلا'' کے متعلق یہ رسالہ، دیگر دو رسالوں کے ساتھ ۱۳۴۴ھ میں شایع ہوا، عنوان تھا ''ثلاث رسائل''

(۸۴) اس سے مراد الصاحبی فی فقہ اللغۃ ہے۔

(۸۵) مفضل بن محمد، ابوالعباس الضبی (ت: ۱۶۸ھ) کوفہ کا باشندہ، عربی ادب کا ماہر تھا۔ اس کی تالیفات میں ''المفضلیات'' مشہور ہے، جو شایع ہو چکی ہے۔

(۸۶) ابوعلی اسماعیل بن القاسم القالی (ت:۳۵۶ھ) جس کی کتاب ''الامالی'' عربی ادب کی بنیادی چار کتابوں میں ایک شمار کی جاتی ہے۔

(۸۷) ابو عبید عبداللہ بن عبدالعزیز البکری (ت: ۴۸۷ھ) ان کی تصانیف میں ''شرح امالی القالی''، ''معجم ما استعجم'' اور المسالک والممالک'' شامل ہیں۔

(۸۸) اخفش اوسط نے ''معانی القرآن'' کے نام ایک مختصر تفسیر القرآن لکھی تھی، جو دو جلدوں میں شایع ہو چکی ہے۔

(۸۹) مبرد کا اصلی نام محمد بن یزید ہے، ۲۸۵ھ میں فوت ہوئے، ان کی ''الکامل'' داخل درس مدارس ہے۔ مبرد کا ''الفاضل'' علامہ میمنی کی تحقیق کے ساتھ مصر سے شایع ہوا۔ اس کا ایک نسخہ جو خود میمنی صاحب نے پروفیسر حسین جلبانی کو ہدیہ کیا۔ راقم کی لائبریری میں موجود ہے۔

(۹۰) ابن ولاد مصری، دو ہیں: ۱۔ محمد بن ولید بن ولاد (ت: ۲۹۸ھ) ۲۔ احمد بن محمد بن ولاد (ت: ۳۳۲ھ) یہاں دوسرا ابن ولاد مراد ہے، جنھوں نے سیبویہ کی حمایت کرتے ہوئے مبرد پر رد لکھا تھا۔

(۹۱) ترجمہ: علم وہ ہے جو حاضر ہو۔

(۹۲) عماد الدین کاتب، محمد بن محمد اصفہانی (ت: ۵۹۷ھ) جن کی کتاب ''خریدۃ العصر'' کا تذکرہ و پر حواشی میں آ چکا ہے۔

(۹۳) ابن مقلہ، محمد بن علی (ت: ۳۲۸ھ) مشہور خوشنویس، خوشنویسی میں ضرب المثل ہے، خلفاء عباسیہ کے وزیر بھی رہے، جیل کی ہوائیں بھی کھائیں، جس ہاتھ سے لکھا کرتے تھے اس کو کاٹ دیا گیا، پھر بھی قلم کو بقیہ بازو سے باندھ کر لکھ سکتے تھے، اور اسی طرح خوبصورت لکھتے تھے، ان کے لیے مشہور ہے کہ تین بار وزیر بنائے گئے، تین اسفار کیے، اور مرنے کے بعد تین بار دفن کیے گئے۔

(۹۴) الحلبۃ فی اسماء الخیل المشھورۃ فی الجاہلیۃ والاسلام (دور جاہلیت اور زمانہ اسلام کے مشہور گھوڑوں کے نام اور تذکرہ) یہ کتاب ریاض سے ۱۹۸۱ء میں شایع شدہ راقم کے پاس موجود ہے۔

(۹۵) پورا نام: محمد بن کامل تاجی صاحبی (ساتویں صدی ہجری سے تعلق رکھتے ہیں)۔

(۹۶) کتب الخیل یعنی گھوڑوں کے متعلق لکھی گئی کتابیں۔ میرے خیال میں اس موضوع پر سب سے پہلے اصمعی عبدالملک بن قریب (ت: ۲۱۶ھ) نے کتاب لکھی، جو ''الخیل'' کے نام سے ۱۸۹۵ء میں ویانا سے شایع ہوئی۔ اس کے بعد ابو عبیدۃ معمر بن المثنیٰ (ت: ۲۲۴ھ) ہیں، جن کی کتاب الخیل کرنکو نے

۱۳۵۸ء میں حیدر آباد دکن سے شایع کی۔

(۹۷) ابو محمد حسن بن احمد، المعروف بالاسود، الغند جانی (ت:۴۳۰ھ) کی یہ کتاب عبدالغنی حسن کی تحقیق کے ساتھ ۱۹۵۱ء میں بسلسلہ ذخائر العرب قاہرہ میں شایع ہوئی

(۹۸) ابن الکلبی کی یہ کتاب ''انساب الخیل فی الجاہلیۃ والاسلام واخبارھا'' کے نام سے علامہ احمد زکی نے ۱۹۴۶ء میں قاہرہ سے شایع کی۔

(۹۹) اس کا مکمل نام شاید ''عقد الاجیاد فی الصافنات الجیاد'' ہے، جو محمد بن عبدالقادر الجزائری الحسنی (ت:۱۳۳۱ھ) کی تالیف ہے، مؤلف نے خود اس کا اختصار ''نخبۃ عقد الاجیاد'' کے عنوان سے تیار کیا تھا، پہلے اختصار شایع ہوا ۱۲۹۳ھ میں، بعد ۱۳۳۱ھ میں قاہرہ سے اصل کتاب بھی شایع ہوئی۔

(۱۰۰) تبریزی خطیب یحییٰ بن علی، ابو زکریا (ت:۵۰۲ھ) لغت وادب عربی کے اماموں میں سے ایک امام تھے۔ انہوں نے ازہری کی ''تہذیب اللغۃ'' ابو العلاء معری سے پڑھی تھی۔

(۱۰۱) نشوان بن سعید حمیری (ت: ۵۷۳ھ) یمن کے حمیری بادشاہوں کے خاندان میں سے تھے۔ پہلے ''القصیدۃ الحمیریۃ'' لکھا، پھر اس کی شرح بھی لکھی۔ یہ قصیدہ شرح کے ساتھ شایع ہوا ہے۔

(۱۰۲) ترجمہ: نجد کے عرار نامی پھولوں کی خوشبو سے نفع اٹھالے۔ کیوں کہ شام کے بعد عرار ہی نہیں رہیں گے۔

(۱۰۳) ترجمہ: ہم آپس میں دو بھائی تھے، زمانے نے ہمارے درمیان کچھ مدت تک جدائی کر دی۔ اور مرد زمانے سے کبھی امن میں نہ رہے۔

(۱۰۴) ابونواس، حسن بن ہانی الحکمی (ت: ۱۹۸ھ) عراق کے مشہور شاعر ہیں۔ ابو عبیدۃ کا فرمانا ہے کہ: جدید شعراء میں ابونواس کی حیثیت اس طرح ہے، جس طرح قدیم شعراء میں امرؤالقیس کی۔ یہ شعر انہوں نے خلیفہ وقت کے دروازے پر لکھا تھا۔

(۱۰۵) کتاب السمط سے مراد ''سمط الآلی علی امالی ابی علی القالی'' ہے، جو علامہ میمنی صاحب کا علمی شاہکار ہے۔

(۱۰۶) حافظ مغلطائی بن قلیچ بکری حنفی (ت:۷۶۲ھ) بڑے مؤرخ، حافظ الحدیث، انساب

ماہر گذرے ہیں۔ ایک سوٴ سے زائد تصنیفات ان سے یادگار ہیں، جن میں صحیح بخاری کی شرح اور اکمال تہذیب الکمال، شامل ہے، انہوں نے سیرت نبوی پر ''الزہر الباسم فی سیرۃ ابی القاسم صلی اللہ علیہ وسلم'' لکھی تھی، جس کے واحد خطی نسخہ کو سامنے رکھ کر ہمارے ایک دوست مولانا احسن احمد عبدالشکور بہاولپوری نے ایڈٹ کیا، جو دارالسلام مصر سے دو جلدوں میں شایع ہوئی ہے۔

(۱۰۷) اس سے مراد شاید مغلطائی کی کتاب ''الاشارہ'' ہے۔

(۱۰۸) ''الروض الانف'' درحقیقت سیرۃ ابن ہشام کی شرح ہے، جو امام ابوالقاسم عبدالرحمٰن بن عبداللہ سہیلی (ت:۵۸۱ھ) نے لکھا، مطبوع اور مشہور ہے۔

(۱۰۹) مغلطائی بن قلیچ کی اس شرح ابن ماجہ کے ایک خطی نسخہ کا ذکر جو کہ مغلطائی نے ۷۳۲ھ میں اپنے ہاتھ سے لکھا، علامہ خیر الدین زرکلی نے الاعلام ۷/ ۲۷۵ میں علامہ عبدالعزیز میمن کے حوالہ سے کیا ہے۔

(۱۱۰) سیوطی کی یہ کتب نحویوں کے طبقات میں ہے، یعنی عربی نحو کے علماء کا تذکرہ ہے۔

(۱۱۱) الاصابۃ فی معرفۃ الصحابۃ'' نامی یہ کتاب، حافظ ابن حجر عسقلانی (ت:۸۵۲ھ)، ابن عبداللہ (ت:۴۶۳ھ) کی کتاب ''الاستیعاب'' اور اس کے ذیل (جو ابن فتحون مالکی نے لکھا تھا) اور ابن الاثیر (ت:۶۳۰) کی کتب ''اسد الغابۃ فی معرفۃ الصحابۃ'' کو سامنے رکھ کر تیار کیا ہے۔

(۱۱۲) جمہرۃ اشعار العرب، مطبوع ہے۔،

(۱۱۳) محمد بن ابی الخطاب القرشی ابوزید (ت:۱۷۰ھ)

(۱۱۴) فاتک رومی (ت:۳۵۰ھ) بلاد روم سے بچپن میں اغوا کیا گیا، متنبی کی اس کے ساتھ محبت تھی، ان کی شان میں ایک قصیدہ لکھا تھا، جس کا مطلع تھا: لاخیل عندک تھدیھا ولا مال

(۱۱۵) العجماء سے مراد چوپایہ ہے، یعنی چوپایہ اگر کسی آدمی کو زخمی کردے تو اس کا جرمانہ نہیں ہے۔ لیکن علامہ میمنی صاحب نے اشارۃً عجماء سے مراد عجمی اور جاہل لوگ لئے، مطلب یہ ہوا کہ اگر یہ لوگ غلطی کریں تو ان کو معافی ہے۔

(۱۱۶) ترجمہ: اگر علم نہیں تو یہ مصیبت ہے اور اگر علم بھی ہے (پھر بھی غلطی کرتا ہے) تو یہ بڑی

مصیبت ہے۔

(۱۱۷) الزجاجی عبدالرحمٰن بن اسحاق النھاوندی (ت: ۳۳۷ھ) اپنے دور میں عربی علوم کے امام شمار کیے جاتے تھے، کافی تصنیفات ان سے یادگار ہیں، جن میں سے ''الجمل فی النحو'' اور ''مجالس العلماء'' راقم کے پاس موجود ہیں۔ اس کی ''جمل فی النحو'' پر ابن ہشام انصاری نے شرح لکھی تھی، وہ بھی دیکھی ہے۔

(۱۱۸) الزجاج ابواسحاق ابراہیم بن السدنی (ت: ۳۱۱ھ)

(۱۱۹) ''دراسات اللبیب فی الاسوۃ الحسنۃ بالحبیب''، علامہ عبدالرشید نعمانی (ت: ۱۴۲۰ھ) کی تحقیق کے ساتھ، ۱۹۵۷ء میں سندھی ادبی بورڈ کی طرف سے شایع ہوئی۔ اس سے پہلے ہندوستان میں شایع ہوئی تھی۔

(۱۲۰) مخدوم محمد معین ٹھٹوی بن مخدوم محمد امین ٹھٹوی (ت: ۱۱۶۱ھ) شاہ ولی اللہ دہلوی (ت: ۱۱۷۴ھ) کے ہمعصر تھے۔ نیز ان سے اجازت الحدیث بھی لی تھی، جب شاہ ولی اللہ سفر حج کے دوران سندھ میں نصرپور اور ٹھٹہ وغیرہ سے گزرے تھے۔ جیسا کہ ''القول الجلی فی آثار الولی'' میں محمد عاشق پھلتی نے لکھا ہے۔ دونوں کے درمیان مراسلت بھی رہی، اس طرح کے ایک دو مراسلات ''تفہیمات'' شاہ ولی اللہ دہلوی میں دیکھے جاسکتے ہیں، نیز ''نادر مکتوبات شاہ ولی اللہ'' میں بھی خطوط شایع ہوئے۔ احقر نے مخدوم محمد معین ٹھٹوی کی تصنیفات کی الفابیٹکل فہرست سہ ماہی مہران ۲۰۱۳/۴ھ میں شایع کرادی ہے، جن کی تعداد ایک سو سے اوپر ہے۔

(۱۲۱) سکاکی، سراج الدین ابویعقوب یوسف بن ابی بکر (ت: ۶۲۶ھ) اپنی کتاب ''مفتاح العلوم'' کی وجہ سے شہرت پائی، جو علم صرف ونحو ومعانی وبیان ومنطق وعروض وقافیہ پر نہایت اچھی کتاب ہے۔ کافی علماء نے اس کی شروح لکھیں، حواشی تحریر فرمائے۔ بعض نے اس کی تلخیص کی۔ علامہ قزوینی محمد بن عبدالرحمٰن (ت: ۷۳۹ھ) نے اس کے قسم ثالث (علوم معانی) کا اختصار ''تلخیص المفتاح'' کے نام سے تحریر فرمایا، جس کی سعدالدین تفتازانی (ت: ۷۹۱ھ) نے دو شرحیں لکھیں: ''مختصر المعانی'' اور ''مطول''۔

(۱۲۲) الکافی فی العروض والقوافی کا مؤلف احمد بن عباد بن شعیب القناء (ت: ۸۵۸ھ)

ہے، پہلے تو بکریاں چراتے تھے، بعد میں از ہر میں داخلہ لیا اور علم حاصل کیا، کھجور کے پتوں سے ہاتھ کے پنکھے بنا کر گذر بسر کرتے تھے۔ اب یہ کتاب مدارس دینیہ کے نصاب میں شامل ہے۔ بعض مدارس میں اس کے بجائے ''محیط الدائرۃ'' پڑھائی جاتی ہے۔ جو ''کرنیلیوس'' کی تالیف ہے۔

(۱۲۳) دمنہوری کے اس شرح کا نام ''الشافی'' ہے۔

(۱۲۴) بن العدیم عمر بن احمد بن ہبۃ اللہ (ت: ۶۶۰ھ) اپنے دور کے عظیم مورخ اور محدث تھے، حلب میں پیدا ہوئے، قاہرہ میں فوت ہوئے۔

(۱۲۵) کتاب الاعلام للزرکلی میں ''علی'' کے بجائے ''عن'' وارد ہے۔

(۱۲۶) حلب پر لکھی گئی، اس تاریخ کا نام ''بغیۃ الطلب فی تاریخ حلب'' ہے، جس کا اختصار بھی انہوں نے لکھا تھا ''زبدۃ الحلب'' کے نام سے جو مطبوع ہے۔

(۱۲۷) ابوالعلاء کا یہ شعر اس کی کتاب ''لزومیات'' یا ''لزوم مالا یلزم''، قافیہ ''باء'' میں موجود ہے۔ راقم کے پاس ''لزوم مالا یلزم'' ندیم عدی کی تحقیق کے ساتھ، دار طلاس، دمشق سے ۳ جلدوں میں شائع شدہ نسخہ موجود ہے، اس کے ساتھ ''مختار اللزومیات'' عمر ابوالنصر والدار الجبل بیروت سے ۱۹۶۹ء میں شائع شدۃ بھی ہے، جس کے آخر میں انہوں نے ان مصادر کو ذکر کیا ہے، جن سے استفادہ کیا ہے، ان میں میمنی صاحب کی ''ابوالعلاء و ما الیہ'' سر فہرست ہے۔

(۱۲۸) ترجمہ: مجھے یقین ہے کہ مضر کی طرف منسوب ہونا میرے لیے نفع مند نہیں، میں سبا کے دونوں بیٹوں (حمیر اور کہلان) کے راستہ پر چلوں گا (یعنی جس طرح وہ فوت ہو گئے، میں بھی مر جاؤں گا۔)

(۱۲۹) آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے سلسلہ نسب میں مضر بن نزار بن معد وارد ہے۔ تو میمنی صاحب کا کہنا یہ ہے کہ یہاں مضر سے اس کے دادا ''معد'' کی طرف اشارہ ہے یعنی معد کی طرف منسوب ہونا مراد ہے۔

(۱۳۰) میمنی صاحب کی یہ کتاب ۱۹۲۶ء میں ''المطبعۃ السلفیۃ'' قاہرہ میں طبع ہو کر، دار المصنفین اعظم گڑھ کی طرف سے شائع ہوئی، جس نے عربی ادب کی دنیا میں تہلکہ مچا دیا۔

(۱۳۱) مخدوم مہائمی علی بن احمد بن علی، ابوالحسن (ت: ۸۳۵ھ) پیدائش و وفات ''مہائم'' میں

ہے۔ وحدۃ الوجود کے قائل تھے۔ انہوں نے فصوص الحکم ابن عربی کی شرح ''خصوص النعم'' کے نام سے لکھی تھی۔ ''عوارف المعارف'' سہروردی کی شرح ''زوارف اللطائف'' کے نام سے لکھی تھی۔

(۱۳۲) ان کی اس تفسیر کا نام ''تبصیر الرحمٰن وتیسیر المنان ببعض ما یشیر الی اعجاز القرآن'' ہے جو دو جلدوں میں طبع ہوئی۔

(۱۳۳) راقم کے کتب خانے میں دمامینی کا جو شرح مغنی اللبیب، شرح شمنی کے ساتھ مطبوع موجود ہے، اس میں اس شرح کا نام ''تحفۃ الغریب'' لکھا ہے، پہلے بھی ذکر کر چکا ہوں کہ اس شرح میں انہوں نے ''مغنی اللبیب'' پر اعتراضات کئے ہیں، تنقید کی ہے، علامہ شمنی احمد بن محمد (ت: ۸۷۲ھ) نے اپنی ''شرح مغنی اللبیب'' مسمی بہ ''المنصف من الکلام علی مغنی ابن ہشام'' میں ان کے اشکالات و اعتراضات کو رفع کیا ہے۔ یاد رہے کہ جو مطبوع ''شرح مغنی اللبیب'' از دمامینی ہے، وہ بھی نصف تک ہے۔ یہ دونوں شرح یکجا ۱۳۰۵ھ میں مصر سے شائع ہوئیں۔

(۱۳۴) ان الصغانی الذی حاز العلوم والحکم کان قصاریٰ امرہ، ان انتھی الی بکم

(۱۳۵) اس سے شاید ''مالحن فی العامۃ'' علی بن حمزہ کسائی (ت: ۱۸۹ھ) کی تالیف مراد ہے۔ اس موضوع پر دیگر علماء نے بھی لکھا ہے۔ مثلاً: ابوحنیفہ دینوری (ت: ۲۹۰ھ) کی کتاب ''لحن العامۃ''، ابو ہلال عسکری (ت: ۳۹۵ھ) کی کتب ''لحن الخاصۃ'' جوالیقی ابو منصور موہوب بن احمد (ت: ۵۴۰ھ) کی کتاب ''تکملہ اصلاح ما تغلط فیہ العامہ''، جو کہ جوالیقی کی دیگر تالیف ''المعرب'' کے آخر میں، احمد شاکر کی تحقیق کے ساتھ ۱۹۳۶ء میں شایع ہوئی، لیکن سب سے مفصل کتاب ''تصحیح التصحیف وتحریر التحریف''، صفدی صلاح الدین خلیل ابن ایبک (ت: ۷۶۴ھ) کی تالیف ہے، جو مکتبۃ الخانجی قاہرہ سے ۱۹۸۷ء میں شایع ہوئی، دونوں راقم الحروف کے زیر مطالعہ رہی ہیں۔

(۱۳۶) ابن السکیت یعقوب بن اسحاق (ت: ۲۴۴ھ) لغت و ادب کے امام تھے، ان کی اس کتاب کا نام (جس کا ذکر میمنی صاحب نے کیا ہے) ''اصلاح المنطق'' ہے، جس کے بارے میں مبرد کا کہنا ہے کہ میں نے بغدادیین کی طرف سے لکھی ہوئی ایسی کتاب آج تک نہیں دیکھی۔

(۱۳۷) ابن بری، ابومحمد عبداللہ (ت: ۵۸۲ھ) انہوں نے اس پر دو حاشیہ تحریر فرمائے۔

(۱۳۸) اس سے مراد شاید ابوعبداللہ محمد بن ابن محمد حجۃ الدین صقلی (ت:۵۵۵ھ) مراد ہیں، جس کے ''حاشیہ درۃ الخواص'' کا تذکرہ حاجی خلیفہ چلپی نے کیا ہے۔

(۱۳۹) شہاب الدین خفاجی، احمد بن محمد المصری (ت:۱۰۶۹ھ) یہ وہی خفاجی ہیں، جنہوں نے ''نسیم الریاض'' کے نام سے ''شفاء'' قاضی عیاض کی شرح لکھی تفسیر بیضاوی پر حاشیہ لکھا۔ ''ریحانۃ الالباء'' کے نام سے شعراء کا تذکرہ بھی اسی ہی کا ہے۔

(۱۴۰) جوالیقی (ت:۵۴۰ھ) کی یہ ''شرح ادب الکاتب''، ۱۳۵۰ھ میں، مصطفیٰ صادق رافعی کے مقدمہ کے ساتھ مکتبۃ القدسی قاہرہ سے شایع ہوئی، راقم کے مطالعہ میں رہی ہے۔

(۱۴۱) ابومحمد عبداللہ بن محمد: المعروف بابن السید البطلیوسی (ت:۴۲۱ھ) بعض نے ان کی وفات ۵۲۱ھ بتائی ہے، ان کی اس ''شرح ادب الکاتب'' کا نام ''الاقتضاب'' ہے مطبوع ہے۔

(۱۴۲) ''سقط الزند'' ابوالعلاء احمد بن عبداللہ المعری (ت:۴۴۹ھ) کی تالیف ہے، جو تین ہزار عربی اشعار پر مشتمل ہے، ابوالعلاء نے خود اس کی شرح بھی لکھی تھی اور نام رکھا ''ضوء السقط''

(۱۴۳) ''ضرام السقط'' صدر الافاضل قاسم بن حسین خوارزمی (ت:۶۱۷ھ) کی تالیف ہے۔

(۱۴۴) شیزری کی وفات کی تاریخ معلوم نہ ہوسکی۔ زرکلی فرماتے ہیں کہ:۶۲۲ھ کے بعد فوت ہوئے۔

(۱۴۵) ''عجائب الاسفار وغرائب الاخبار'' کا تذکرہ کرتے ہوئے حاجی خلیفہ نے کشف الظنون میں اس کے مؤلف کو ''شیرازی'' کر کے لکھا ہے۔ ممکن ہے یہ شیزری کی تحریف، کاتبوں کی طرف سے ہو۔

(۱۴۶) شہاب الدین احمد بن عمر دولت آبادی (ت: ۸۴۹ھ) دولت آباد میں پیدا ہوئے، جونپور میں فوت ہوئے، ملک العلماء (علماء کا بادشاہ) کے لقب سے مشہور تھے۔ انہوں نے کافیہ ابن حاجب کی شرح بھی لکھی تھی، جو شرح ہندی کے ساتھ مشہور ہے، جس سے خود ملا جامی نے بھی کافیہ کی شرح لکھتے ہوئے استفادہ کیا ہے۔ دولت آبادی نے ''قصیدہ بانت سعاد'' کی شرح بھی لکھی ہے۔

(۱۴۷) ''البحر المواج'' جو قرآن مجید کی تفسیر میں انہوں نے لکھی ہے، راقم کی لائبریری میں، اس کا خطی نسخہ موجود ہے۔

(۱۴۸) ابن قتیبہ عبداللہ بن مسلم دینوری (ت: ۲۷۶ھ)۔ ویسے تو انہوں نے کافی کتابیں لکھی تھیں۔ البتہ ان کی مندرجہ ذیل کتب بہت متداول ہیں۔ ادب الکاتب، المعارف، عیون الاخبار، الامامۃ والسیاسۃ، تأویل مختلف الحدیث وغیرہ

(۱۴۹) اُفوہ الاودی کا اصل نام: صلاءۃ بن عمرو بن مالک ہے۔ زرکلی کی تحقیق کے مطابق وہ ہجرت نبوی سے پچاس سال پہلے فوت ہوئے۔ اس کا یہ شعر مشہور ہے:

لا یصلح الناس فوضی لاسراۃ لھم

ولا سـراۃ لھم إذا جھالھم سادوا

(۱۵۰) ترجمہ: عمرو بن مسیح طائی رضی اللہ عنہ، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس وفد لے کر آئے تھے، سارے عرب میں ان جیسا تیر انداز نہیں تھا، یہ وہی تو ہے، جس کے بارے میں امرؤ القیس نے کہا ہے شعر: بنی ثعل سے تعلق رکھنے والے تیر انداز نے اپنے دونوں ہاتھوں کو پردہ سے باہر نکالا ہے الخ، ڈیڑھ سو سال عمر پائی، یہ معلوم نہیں کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی وفات مبارکہ سے پہلے فوت ہوئے یا بعد میں۔ اس سلسلہ میں ''اسد الغابۃ فی معرفۃ الصحابہ'' ۴/ ۲۸۷ بھی دیکھنی چاہیے۔

(۱۵۱) ترجمہ: آپ کا مکتوب شریف موصول ہوا، آپ کی صحت وسلامتی پر اللہ تعالیٰ کا ثناء خواں ہوں، اور اس سے دعا کرتا ہوں کہ صبح وشام یہ صحت وسلامتی ہمیشہ رہے۔ باقی آپ نے جو پوچھا ہے سو اس کی حقیقت یہ ہے کہ یہ الفاظ تحریف کا نتیجہ ہیں، جس نے آپ کو تکلیف میں ڈال رکھا ہے۔ اصل صحیح لفظ ''فسکل'' ہے، فسکل اس گھوڑے کو کہا جاتا ہے جو ریس کے گھوڑوں کے اندر، آخر میں رہے۔ اس کو سکیت بھی کہتے ہیں، یعنی: پھسڈی، حدیث میں ہے: (جس طرح نہایہ، مجمع بحار الانوار اور تاج میں ہے) حضرت بی بی اسماء زوجہ علی رضی اللہ عنہما نے حضرت علی رضی اللہ عنہ کو فرمایا: تم تین اچھے آدمیوں میں سے آخری ہو، تو حضرت علی نے بی بی اسماء کے بچوں کو فرمایا (اسماء بن عمیس نے) مجھے فسکل کی طرح آخر میں رکھا۔ بی بی اسماء کی پہلی شادی حضرت جعفر بن ابی طالب کے ساتھ ہوئی تھی۔ ان کی شہادت کے بعد حضرت ابی بکر رضی اللہ عنہ سے شادی

ہوئی، ان کی وفات کے بعد حضرت علی کرم اللہ وجہہ سے شادی کی۔ باقی رہا ''دعائم الاسلام'' میں وارد حدیث کی بات، تو ایسی مرفوع احادیث اھل السنۃ کے پاس بھی وارد ہیں۔ میں نے آپ کا مدعا پورا کر دیا۔ اب ''لو'' اور ''لیت'' کی گنجائش بھی نہ رہی (یعنی چوں اور چناں کی گنجائش بھی نہ رہی) والسلام

(۱۵۲) محمد بن ہانی بن محمد ازدی اندلسی (ت:۳۶۲ھ) مہلب بن ابی صفرۃ کی اولاد میں سے تھے، مغربیوں کے ہاں سب سے بڑا شاعر شمار ہوتا ہے، ان کے ہاں اس کی منزلت ایسی ہے جیسے مشرقیوں کے پاس متنبیؔ کی۔

(۱۵۳) ابن ھانی کا دیوان ڈاکٹر زاہد علی کی تحقیق وشرح کے ساتھ ''تبیین المعانی فی شرح دیوان ابن ہانی'' کے نام سے شایع ہوا۔ اس کا انہوں نے انگریزی میں بھی ترجمہ کیا تھا۔

(۱۵۴) یہاں ''معز'' سے مراد معد بن اسماعیل فاطمی عبیدی، معزلدین اللہ (ت:۳۶۵ھ) ہے جو مصر کی والی تھی، قاہرہ (مصر کا دارالحکومت) اس کے فوجی کمانڈر جوہر نے بنایا، جس میں اس کو دو سال لگے (۳۵۹ھ تا ۳۶۱ھ)

(۱۵۵) بحتری ولید بن عبید بن یحییٰ طائی (ت:۲۸۴ھ) بحتری ان تین شعراء میں سے ایک شمار ہوتے ہیں، جو اس دور کے بہترین شعراء سمجھے جاتے تھے، متنبی، ابوتمام اور بحتری۔ بلکہ ابوالعلاء مصری سے پوچھا گیا کہ ان تینوں میں سے زیادہ اچھا شاعر کون ہے؟ تو فرمایا: متنبیؔ اور ابوتمام تو اپنے دور کے حکیم تھے، باقی شاعر تو بحتری ہی ہے (جیسا ہمارے ہاں نفحۃ الیمن اور نفحۃ العرب کے بارے میں کسی سے پوچھا گیا کہ ان میں سے عربی ادب میں زیادہ بہتر کونسا ہے؟ تو فرمایا: نفحۃ العرب تو وعظ ونصیحت کی کتاب ہے۔ عربی ادب سے اس کا کیا واسطہ!!

(۱۵۶) احمد بن حمدان اور سامی ابوحاتم رازی (ت:۳۲۲ھ) اسماعیلی فرقہ کے زعماء میں سے ہیں۔ جبکہ اسی ہی کنیت کے ساتھ دو اور علماء ہیں جو اہل سنت کے امام گذرے ہیں ۱۔ ابوحاتم محمد بن ادریس بن المنذر الرازی (ت:۲۷۷ھ) بخاری ومسلم کے ہمعصر تھے ۲۔ ابن ابی حاتم رازی عبدالرحمٰن بن محمد (ت:۳۲۷ھ)

(۱۵۷) خطیب بغدادی احمد بن علی بن ثابت (ت:۴۶۳ھ) مشہور تاریخ دان اور محدث،

مصطلح الحدیث کے ہر فن میں انہوں نے طبع آزمائی کی۔ تاریخ بغداد ۱۴ جلدوں میں لکھی اور اس کی وجہ سے شہرت پائی، حافظ ابن عساکر نے جب دیکھا کہ خطیب نے بغداد (جو کہ عباسیوں نے تعمیر کیا) کی تاریخ لکھی ہے، تو اسے شوق پیدا ہوا کہ دمشق کی تاریخ لکھے، جو قدیم شہر ہے، پھر انہوں نے ''تاریخ دمشق'' ۸۰ جلدوں میں تحریر فرمائی۔

(۱۵۸) ابوعبید اللہ محمد بن عمران بن موسیٰ المرزبانی (ت: ۳۸۴ھ) عربی کے مشہور ادیب، ولادت و وفات بغداد میں ہوئی، آباؤ اجداد خراسان سے تعلق رکھتے تھے۔ مسلکاً معتزلہ تھے۔ ابن الندیم نے اس کی کافی کتب کا تذکرہ کیا ہے۔ کہتے ہیں کہ ان کی کتاب ''المفید فی الشعر ومذاہبھم'' ۵ ہزار اوراق پر مشتمل ہے۔

(۱۵۹) ابوعلی حسن بن احمد فارسی (ت: ۳۷۷ھ) اس کی مشہور کتاب ''الایضاح'' ہے، جو راقم کے مطالعہ میں رہی ہے، فارس کے شہر ''فسا'' میں پیدا ہوئے، ۳۰۷ میں بغداد آئے اور فوت بھی وہیں ہوئے۔ خیر الدین زرکلی نے، علامہ عبدالعزیز میمنی کی قلمی علمی ڈائری کے حوالے سے لکھا ہے کہ کتب خانہ شہید علی، استنبول میں ۲۵۱۶ نمبر پر ابوعلی فارسی کے رسائل کا مجموعہ، احمد بن نعیم بن ہشام اللبلی کے ہاتھ کا لکھا ہوا، موجود ہے، جو انہوں نے ۶۱۵ھ میں لکھا۔

(۱۶۰) امام الحرمین عبدالملک بن عبداللہ الجوینی (ت: ۴۷۸ھ) نیساپور کے قریب ''جوین'' نامی گاؤں میں پیدا ہوئے۔ حرمین میں ۴ سال رہے۔ نظام الملک طوسی نے ان کے لیے نیساپور میں مدرسہ نظامیہ بنایا، جہاں درس دیتے رہے، بڑے بڑے علماء ان کے درس میں شریک ہوتے تھے۔

(۱۶۱) بشار بن برد العقیلی (ت: ۱۶۷ھ) تخار افغانستان سے تعلق رکھتے تھے، بغداد میں رہے شعراء مولدین میں اس کا رتبہ سب سے بڑا ہے۔

(۱۶۲) ''تاج المصادر'' للبیہقی مراد ہے۔

(۱۶۳) لسان العرب لابن منظور افریقی مراد ہے۔

(۱۶۴) معاجم، معجم کی جمع ہے، جس کے معنی ہیں: ڈکشنری۔

(۱۶۵) مجد الدین محمد بن یعقوب فیروز آبادی (ت: ۸۱۷ھ) لغت وحدیث وتفسیر کے امام

تھے، پیدا تو شیراز کے قریب ایک گاؤں میں ہوئے لیکن وفات پائی زبید (یمن) میں، ان کی تصانیف میں: ''القاموس المحیط''، ''المغانم المطابۃ فی معالم طابۃ''، ''بصائر ذوی التمییز''، نامی تفسیر شامل ہے۔ تفسیر ابن عباس جو ہمارے ہاں مطبوعہ ملتی ہے، وہ بھی درحقیقت ان کی جمع کردہ ہے۔ ان کی کتاب ''سفر السعادۃ''، لیکن شیخ عبدالحق محدث دہلوی نے شرح لکھی، جو ''شرح سفر السعادۃ'' کے نام سے مطبوع ملتی ہے۔

(۱۶۶) محمد بن حبیب الہاشمی ابوجعفر البغدادی (ت: ۲۴۵ھ) انساب ولغت وشعر کے ماہر تھے۔ ان کی اس کتاب کا پورا نام ''من نسب الی امہ من الشعراء'' ہے۔

(۱۶۷) ابن سیدہ، علی بن اسماعیل ابوالحسن (ت: ۴۵۸ھ) لغت کے امام تھے۔۔۔اندلس میں پیدا ہوئے۔ نابینا تھے۔ ان کے والد بھی نابینا تھے۔ عربی لغت میں دو کتابیں ''المخصص'' اور ''در المحکم والمحیط الاعظم''، لکھیں ان کی وجہ سے شہرت پائی۔ المخصص ۵ جلدوں میں اور المحکم ۱۲ جلدوں میں راقم کے ہاں موجود ہے۔

(۱۶۸) شرح شواہد سیبویہ کے نام یہ کتاب دو جلدوں میں راقم کے پاس موجود ہے۔

(۱۶۹) دیوان صائب اس مخطوطہ کا عکس چھپ چکا ہے، جو راقم کے پاس موجود ہے۔

(۱۷۰) مصنف سے مراد علامہ مجدالدین محمد بن یعقوب فیروزآبادی (ت: ۸۱۷ھ) ہیں۔

(۱۷۱) (ترجمہ): میں نے کھانوں کو چھوڑ کر عوض وفدیہ میں صحت لی ہے، اب میرے ساتھ نہ کوئی بیماری ہے، نہ پیٹ کی سوجن۔

(۱۷۲) اصمعی، عبدالملک بن قریب (ت: ۲۱۰ھ) علم لغت میں سمندر تھے۔ تقریباً پچاس کتب ورسائل تحریر فرمائے۔ جن میں اکثر کا تعلق عربی لغت سے اور بعض کا واسطہ عربی نحو سے ہے۔ وہ ابوعطاء السندی کے بڑے قدردان تھے۔ ڈاکٹر نبی بخش بلوچ نے ''نتف من شعر ابی عطا'' کے مقدمے میں ''مراتب النحویین'' کے حوالہ سے لکھا ہے کہ: ایک دن ان کی مجلس میں ایک شخص نے ابوعطاء سندھی کی شاعری میں عیب نکالے، تو اصمعی نے ان کو آڑے ہاتھوں لیا اور ابوعطاء سندھی کا دفاع کیا۔

(۱۷۳) ابوعطاء السندی: افلح بن یسار: ۱۸۰ھ کے بعد وفات پائی، بڑے شاعر تھے، ان کے والد سندھی عجمی تھے۔ اس لیے فصیح عربی نہیں بول سکتے تھے۔ وہ ''جیم'' کو ''زاء''، ''شین'' کو ''سین'' کے تلفظ سے

ادا کرتے تھے۔ ''حاء'' کو ''ھاء''، ''طاء'' کو ''تاء''، ''عین'' کو ہمزہ کر کے پڑھنا تو ہر عجمی کا وطیرہ ہے۔ ڈاکٹر نبی بخش بلوچ صاحب ''نتف من شعر ابی عطاء'' میں اس کے بارے میں عجیب قصہ نقل فرمایا ہے۔ جس کا خلاصہ یہ ہے کہ کچھ لوگ اکھٹے ہوئے کہ ابو عطاء سندھی سے ایسے الفاظ وکلمات نکلواتے ہیں، جس سے ان کی لکنت زبانی ظاہر ہوجائے۔ ان سے پوچھنے لگے کہ نیزے کی چوٹی کو کیا کہتے ہیں؟ انہوں نے جواب دیا: ''زُزُّ'' (عربی میں اس کو ''زُجٌ'' کہا جاتا ہے۔) پھر پوچھا: بنی تمیم کی وہ مسجد جو بنی ابان سے ایک میل کے فاصلے پر ہے، اس کا نام کیا ہے؟ جواب دیا: مسجد بنی سیطان (مسجد بنی شیطان) بہر حال یہ ایک تفصیلی قصہ ہے، اور منظوم ہے، وہاں دیکھنا چاہیے۔ عطاء اس کا بیٹا نہیں تھا، بلکہ انہوں افلح نامی ایک لڑکے متبنّیٰ (لے پالک) قرار دیا۔ اور اس کا نام عطاء رکھ کر، خود کو ابو عطاء بولنے لگا، وجہ یہ تھی کہ ان کی زبان میں ایک تو لکنت تھی، دیگر یہ کہ سندھیت بھی غالب تھی، اس لئے اس کو ضرورت تھی ایسے راوی کی جو اس کی شاعری بیان کر سکے۔ اور عطاء نامی یہ لڑکا یہ کام خوب سرانجام دے سکتا تھا۔

(۱۷۴) حسین بن محسن یمانی انصاری (ت: ۱۳۲۷ھ) اصل یمن کے تھے، پھر ہندوستان آئے، اور یہیں کے ہو رہے۔ بمبئی میں فوت ہوئے۔ وہ یہاں سندھ میں ''پیر جھنڈو'' میں بھی آئے تھے۔ معمر تھے (۱۲۲۵ھ) میں تو ان کی ولادت ہے مولانا عبید اللہ سندھی اور مولانا عبداللہ لغاری نے ان سے اجازت فی الحدیث لی۔ عبداللہ لغاری کو جو اجازت فی الحدیث مرحمت فرمائی، وہ راقم الحروف کے ہاں موجود و محفوظ ہے۔ وہ شیخ عابد سندھی (ت: ۱۲۵۷ھ) کے ایک واسطے (محمد بن ناصر حازمی) سے شاگرد تھے۔

(۱۷۵) ابجد العلوم، نواب صدیق حسن خان کی تالیف ہے۔

(۱۷۶) یہ کتاب اب چار جلدوں میں شایع ہو چکی ہے۔

(۱۷۷) سرقسطی، قاسم بن ثابت (ت:۳۰۲ھ) اندلس کے باشندے تھے۔ اپنے والد صاحب کے ساتھ مصر ومکہ کا سفر کیا۔ کہتے ہیں کہ خلیل فراہیدی کی کتاب ''العین'' کو اندلس میں متعارف کروانے والے دونوں باپ بیٹے تھے۔ ان سے پہلے اندلس والوں کو اس کا پتہ نہیں تھا۔

۱۴۳۵/۵/۱۹ھ — راقم الحروف محمد ادریس سومرو، قاسمیہ لائبریری

۲۰۱۴/۳/۲۱ — کنڈیارو

تعارف کتاب

ڈاکٹر بلوچ صاحب نے اپنے زندگی کے اسفار کو مختلف اوقات میں قلمبند کیا اور محفوظ رکھا، اور نصف صدی کے بعد شایع بھی کروایا۔

۱۔ جونا گڑھ میں اپنے قیام اور علمی تحصیل کے حالات بعنوان ''قاضی احمد میاں اختر مرحوم اور جونا گڑھ کی یاد میں'' مجلۂ تحقیق ۸۔۹ (۱۹۹۴۔۹۵) میں شایع کرائے (ص: ۱۶ تا ۲۷)، جس میں کچھ حالات قیام کراچی اور قیام حیدر آباد کے بھی شامل تھے۔

۲۔ علی گڑھ میں قیام کے احوال ''ایام علی گڑھ (۱۹۴۱ء۔۱۹۴۵ء) کے عنوان سے، علی گڑھ میگزین، علی گڑھ مسلم یونیورسٹی علی گڑھ کے خصوصی شمارہ (علی گڑھ آئینہ ایام میں) ۹۷۔۱۹۹۵ء میں شایع کرائے (ص: ۲۱۸ تا ۲۳۷)۔

۳۔ امریکہ میں ایام تحصیل کا تذکرہ، ان کی کتاب ''مولانا آزاد سبحانی، تحریک آزادی کے ایک مقتدر رہنما (ناشر: ادارۂ تحقیقات پاکستان، دانشگاہ پنجاب، لاہور۔ ۱۹۸۹ء) کے پیش لفظ ''ل'' تا ''ص'' میں موجود ہے۔

۴۔ ترکی میں اپنے علمی اسفار کی روداد، مجلۂ تحقیق (شعبۂ اردو سندھ یونیورسٹی) ۷ (۱۹۹۳ء) میں شایع کروائی۔

ان چاروں تحاریر کو اس کتاب میں مدون کیا گیا ہے۔

محکمۂ ثقافت، حکومت سندھ